فہرست

شذرات	اسلام اور فنون لطیفہ	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۲۴۹-۲۵۶)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	نماز عصر کا وقت	زاویۂ فراہی	۱۵
دین و دانش	قانون عبادات	جاوید احمد غامدی	۱۹
حالات و وقائع	مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ	محمد عمار خان ناصر	۳۳
	عروج و زوال کا قانون (۵)	ریحان احمد یوسفی	۵۴
ادبیات	''رجعت پسندی''	ڈاکٹر خورشید رضوی	۶۵
	غزل	جاوید احمد غامدی	۷۱

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسلام اور فنون لطیفہ

وہ فنون جو انسان کے نفسی اور جمالیاتی وجود کے لیے حظ اور تسکین کا سامان فراہم کریں، فنون لطیفہ کہلاتے ہیں۔ شعروادب، سازوسرود، تصویر و تمثیل اور لہوولہب سے متعلق تمام فنون، فنون لطیفہ ہی ہیں۔ ہمارے ہاں، بالعموم یہ تصور پایا جاتا ہے کہ اسلام انھیں ناپسند کرتا ہے۔ ان میں سے بالخصوص تصویر اور موسیقی کے بارے میں حتمی طور پر کہا جاتا ہے کہ دین میں یہ چیزیں بالکل ممنوع ہیں۔ مذہبی حلقے تصویر اور موسیقی سے متعلق تمام فنون کو دین اور فطرت سے انحراف کا نتیجہ قرار دیتے اور ان سے مطلق گریز ہی کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس معاملے میں اسلام کی صحیح تعبیر نہیں ہے۔ یہاں ہم تصویر اور موسیقی کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر مختصر طور پر پیش کر رہے ہیں۔

تصویر کے حوالے سے اگر قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تصویر کی حرمت کہیں بیان نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس، اس میں مثبت طور پر، تصویر کا ذکر موجود ہے۔ سورۂ سبا میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے تابع فرمان جنوں کے ذریعے سے تصویریں بنواتے تھے۔ یہ تصویریں ان کے دربار میں آویزاں ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر جیسی جلیل القدر ہستی جو فطرت صالحہ کا بہترین مظہر ہوتی ہے، کوئی ایسا عمل نہیں کر سکتی، جو دین وشریعت کے خلاف ہو۔

دوسری طرف کتب حدیث میں ہمیں متعدد ایسی روایات ملتی ہیں، جو تصویر کی حرمت بیان کرتی ہیں۔ جب ہم اس موضوع کی تمام روایات جمع کر کے، ان کے پس منظر پر غور کرتے اور انھیں ان کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تصاویر کو درحقیقت بتوں کی سی حیثیت حاصل تھی۔ وہ اسی طرح پوجی جاتی تھیں جس طرح بت پوجے جاتے تھے۔ اہل عرب اپنے دیوتاؤں کی شبیہیں بنا کر ان کی پرستش کرتے تھے۔ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے انھیں پکارتے، مشکلات میں ان سے مدد طلب کرتے اور عبادت کے لیے ان کے سامنے سجدہ ریز ہوتے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھے۔ کعبۃ اللہ کی دیواروں پر، اسی نوع کی بہت سی تصویریں کندہ تھیں۔ بعض دوسری ہستیوں کے علاوہ، ان دیواروں پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تصاویر بھی کندہ تھیں۔ اہل کلیسا کا معاملہ بھی مختلف نہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے مطابق، کلیساؤں کی دیواروں پر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی تصویریں آویزاں تھیں اور لوگ ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے تھے۔

ان احادیث کے پس منظر اور سیاق وسباق پر غور کے بعد، جب ہم ان کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں ممنوعہ تصویروں کے لیے 'ھذہ الصور' (یہ تصویریں) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں 'ھذہ' (یہ) کے استعمال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان سے مراد، کچھ مخصوص نوعیت ہی کی تصویریں ہیں۔ بلا تخصیص، ہر طرح کی تصویریں ان سے ہرگز مراد نہیں ہیں۔

احادیث پر اس غور وخوض کے نتیجے میں، دو باتیں، صاف طور پر، معلوم ہوتی ہیں: ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تصاویر مشرکانہ عقاید ہی کا بدترین مظہر تھیں، اور دوسرے یہ کہ روایات کے الفاظ خاص نوعیت کی مشرکانہ تصاویر ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاشرے میں توحید کی دعوت لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ آپ کے منصب کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ اپ معاشرے کو شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنے اور توحید کو لوگوں کے عقیدہ و عمل میں راسخ کرنے کے لیے سعی وجہد کریں۔ چنانچہ آپ نے شرک کی بیخ کنی کے لیے، جہاں بتوں کو توڑنے کا اعلان کیا، وہاں شرک سے آلودہ تصاویر کو بھی، ہر لحاظ سے ممنوع قرار دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تصاویر پر غیر مشروط پابندی کی دلیل کے طور پر اکثر صحیح بخاری کی یہ روایت بیان کی جاتی ہے:

> ''جو لوگ یہ تصاویر بناتے ہیں، وہ قیامت کے دن سخت سزا کے مستحق ہوں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ وہ ان تصویروں میں جان ڈالیں۔ (لیکن وہ ایسا نہیں کر سکیں گے)۔'' (بخاری، کتاب اللباس)

اس حدیث میں ''یہ تصویریں'' کے الفاظ، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، خاص نوعیت کی ان تصویروں ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ آپ نے دراصل یہ فرمایا کہ ایسی مشرکانہ تصویریں بنانے والے، قیامت کے روز سخت سزا پائیں گے۔ اس وقت وہ ہستیاں ان کی کوئی مدد نہیں کریں گی، جن کی یہ تصویریں بناتے اور انھیں نافع اور ضار سمجھ کر ان سے مدد طلب کرتے تھے۔ اس موقع پر ان سے کہ جائے گا کہ اگر وہ ہمت رکھتے ہیں تو ان تصویروں میں جان ڈال کر بھی دکھائیں۔ یہ تقاضا ظاہر ہے کہ انھیں رسوا کرنے ہی کے لیے کیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تورات نے بھی ایسی ہی تصاویر کو ممنوع قرار دیا ہے جن کے ساتھ مشرکانہ رسوم وابستہ تھیں۔ کتاب احبار میں ہے:

> ''تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھری کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا

کہ اسے سجدہ کرو۔'' (۱:۲۶)

اس بنا پر ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احادیث میں بیان کی گئی تصویر کی حرمت، دراصل شرک کی علت پر مبنی ہے۔ چنانچہ جن تصویروں میں یہ علت موجود ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی میں لازماً حرام ہیں۔ جن تصویروں میں یہ علت موجود نہیں ہے، ان کے جائز ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ علت اگر کسی انسان کی تصویر میں جوجود ہے، جیسے کہ مہاتما بدھ کی تصویر، تو وہ ممنوع ہوگی۔ یہ علت اگر کسی جانور کی تصویر میں موجود ہے، جیسے کہ ہندوستان میں گائے کی تصویر، تو وہ ممنوع گی۔ اور یہ علت اگر کسی بے جان کی تصویر میں موجود ہے، جیسے کہ ہندوستان میں پیپل کے درخت کی تصویر، تو وہ بھی ممنوع ہو گی۔

جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے تو اس موضوع کے حوالے سے ہم جب قرآن مجید سے رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے موسیقی اور اس کے متعلقات کی حرمت بیان نہیں کی ہے۔ یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ دیگر الہامی کتابوں میں سے ''زبور'' بنیادی طور پر ان حمدیہ گیتوں کا مجموعہ ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام نے بربط (قدیم طرز کا ایک ساز) پر گائے تھے۔ اسی وجہ سے زبور کے ہر باب کے آغاز میں یہ جملہ درج ہوتا ہے: ''میر مغنی کے لیے داؤد کا مزمور، جسے اس نے بربط پر گایا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

موسیقی کے حوالے سے جب ہم احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کے جواز اور حرمت، دونوں پہلوؤں سے روایات ملتی ہیں۔ حرمت کی روایتیں اگرچہ محدثین کے نزدیک لائق جرح وتنقید ہیں، تاہم انھیں قبول بھی کرلیا جائے تب بھی ان سے زیادہ سے زیادہ سد ذریعہ کے اصول کے تحت کسی وقتی حرمت ہی کا قانون اخذ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موسیقی کی محفلیں اخلاق باختگی کا بدترین مظہر تھیں۔ نوجوان لونڈیاں، شراب میں مخمور مردوں کے سامنے ناچ گانے کا مظاہرہ کرتی تھیں اور ان کے جذبات برانگیختہ کر دیتی تھیں۔ ان محفلوں میں جذبات کی شدت کا اندازہ جنگ بدر کے بعد کے ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ امام بخاری کی صحیح میں بیان ہوا ہے کہ حضرت حمزہ چند انصاریوں کے ہمراہ موسیقی کی ایک محفل میں شریک تھے۔ انھوں نے شراب بھی پی رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ نشے کی کیفیت میں تھے۔ اس حالت میں گانے والی کے الفاظ کی پیروی کرتے ہوئے، جذبات کی شدت میں انھوں نے قریب موجود ایک اونٹنی کے کوہان کاٹ ڈالے اور اس کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انسانی نفوس کو آلایشوں سے پاک کیا جائے۔ تزکیۂ نفس کے اس مقصد کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان تمام ذرائع کو ممنوع قرار دیا جائے، جو لوگوں کو جزبات کی برائی پر ابھارتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے آلات موسیقی کے ایسے استعمالات کو ممنوع قرار دیا اور معاشرے کو صحت مند خطوط پر استوار کرنے کے لیے، ناچ گانے کی محفلوں پر پابندی عائد کر دی۔ موسیقی پر یہ پابندی ظاہر ہے کہ علی الاطلاق نہیں تھی، بلکہ اس زمانے کے مخصوص حالات میں اور موسیقی کی مخصوص نوعیّتوں کے حوالے سے تھی۔

بعض اوقات کسی چیز کا غلط استعمال اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس پر مطلقاً پابندی عائد کرنی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی موقعے پر ہماری حکومت یہ محسوس کرے کہ کوئی آلہ مثلاً وی سی آر کسی بڑے فتنے کا سبب بن رہا ہے، تو وہ کسی خاص مدت کے لیے اس کے ہر طرح کے استعمال پر پابندی لگا سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے زمانے کے مخصوص حالات میں موسیقی پر پابندی عائد کرنا، درحقیقت اسی طرح کا معاملہ تھا۔

درج بالا استدلال کی روشنی میں، تصویر اور موسیقی کی ممانعت کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے اور یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ ان میں وہ کون سے مفاسد تھے جنھوں نے ان کی حلت کو حرمت میں تبدیل کیا۔ تصاویر کا مفسدہ ان سے متعلق مشرکانہ عقائد و مراسم تھے اور موسیقی کا مفسدہ اس کا اخلاق باختہ ہونا تھا۔ پہلی چیز توحید کو متاثر کرتی ہے، جس پر دین کی اساس ہے اور دوسری چیز اخلاق کو متاثر کرتی ہے جس پر صالح معاشرت کی بنیاد ہے۔

چنانچہ ہم سمجھتے ہیں کہ تصویر کی ممانعت مخصوص حالات میں اور بعض مخصوص نوعیّتوں کے اعتبار ہی سے ہو سکتی ہے۔ یہ اگر کوئی غیر اخلاقی رویہ پیدا نہ کریں اور مشرکانہ رجحانات کو تقویت نہ بخشیں تو سراسر جائز ہیں۔ اسی طرح وہ موسیقی جو فوج کا مورال بلند کرتی یا لوگوں میں اچھے جذبات پیدا کرتی ہے، ممنوع نہیں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ''غبار خاطر'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس بات کی عام طور پر شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے، اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے، حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہانے سدومسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا، اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا نہ کہ تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع ہے، ہر چیز جو سوئے استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے قضاءً رد کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔'' (۳۶۳)

تصویر اور موسیقی کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ کے بارے میں بھی اسلام کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ یہ علی الاطلاق ممنوع نہیں ہیں۔ یہ ان کا غلط استعمال ہے جس کی وجہ سے یہ بعض حالات میں ممنوع قرار دیے جا سکتے ہیں۔

ـــــ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۵۴)

(گزشتہ سے پیوستہ)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ

(بنی اسرائیل کی حکومت سنبھالنے کے بعد) پھر جب طالوت فوجیں لے کر نکلے تو [۶۵۶] اُنھوں نے (لوگوں کو) بتایا کہ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ایک ندی کے ذریعے سے تمھیں آزمائے گا۔ [۶۵۷] اِس کی صورت یہ ہوگی کہ جو اِس کا پانی پیے گا، وہ میرا ساتھی نہیں ہے اور جس نے اِس (ندی) سے کچھ نہیں چکھا، [۶۵۸] وہ میرا

[۶۵۶] بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلستیوں کے مقابلے میں تھی جن کا سردار اُس زمانے میں جاتی جولیت تھا۔ قرآن نے اُس کا ذکر جالوت کے نام سے کیا ہے۔ سموئیل (۱) میں یہ واقعہ اِس طرح بیان ہوا ہے:

> ''پھر فلستیوں نے جنگ کے لیے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے اور شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے۔ اور ساؤل اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلا کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لیے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی۔ اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور اُن دونوں کے درمیان وادی تھی۔'' (۱/۱۷: ۱-۳)

[۶۵۷] اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ، ظاہر ہے کہ طالوت کو سموئیل علیہ السلام کی وساطت سے معلوم ہوا اور اِسی بنا پر اِسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا۔

اٰمَنُوْا مَعَهٗ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ، قَالَ الَّذِيْنَ
يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ
مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ، قَالُوْا: رَبَّنَآ اَفْرِغْ
عَلَيْنَا صَبْرًا، وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا، وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ. ﴿٢٥٠﴾

ساتھی ہے۔ ہاں، مگر اپنے ہاتھ سے[٦٥٩] ایک چلو کوئی پی لے تو پی لے۔ لیکن ہوا یہ کہ اُن میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا باقی سب نے اُس (ندی) کا پانی پی لیا۔[٦٦٠] پھر جب طالوت اُس کے پار اترے اور اُن کے وہ ساتھی بھی جو اپنے ایمان پر قائم رہے،[٦٦١] (اور فوجیں دیکھیں) تو (جو لوگ آزمایش میں پورے نہیں اترے تھے)، اُنھوں نے کہہ دیا کہ ہم تو آج جالوت اور اُس کے لشکروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اِس پر وہ لوگ جنھیں اللہ سے ملنے کا خیال تھا،[٦٦٢] بول اُٹھے کہ (حوصلہ کرو، اِس لیے کہ) بہت جگہ ایسا ہوا ہے کہ اللہ کے حکم سے چھوٹے گروہ بڑے گروہوں پر غالب آئے ہیں، اور اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔[٦٦٣] اور (یہی سچے مسلمان تھے کہ) جب جالوت اور اُس کی فوجوں کا سامنا ہوا تو اُنھوں نے

---

[٦٥٨] اصل میں 'من لم یطعمه' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ اِس امتحان میں سو فی صدی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ ندی کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں۔

[٦٥٩] 'اپنے ہاتھ سے' کی یہ قید اِس لیے لگا دی ہے کہ معاملہ گلاس اور کٹورے تک نہ پہنچ جائے۔

[٦٦٠] بائیبل میں اِس امتحان کا ذکر نہیں ہے، لیکن اِسی سے ملتے جلتے ایک دوسرے امتحان کا ذکر ہے۔ اِن دونوں کو دیکھنے کے بعد ہر صاحب ذوق خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ اِس معاملے میں قرآن کا بیان ہی ہر پہلو سے قرین عقل بھی ہے اور بامقصد اور نتیجہ خیز بھی۔

[٦٦١] اصل الفاظ ہیں: 'والذین امنوا معه'۔ اِن میں 'امنوا' کا فعل، قرینہ دلیل ہے کہ اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اِس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ جو لوگ اِس امتحان میں پورے نہیں اترے، وہ اپنے ایمان کے دعووں میں بھی پورے نہیں تھے۔

[٦٦٢] یہ اِس لیے فرمایا کہ خدا کی راہ میں موت اگر بندۂ مومن کو اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہوتی ہے تو اُس کے اِسی عقیدے کی بنا پر ہوتی ہے کہ وہ اِس موت سے مرے گا نہیں، بلکہ حقیقی زندگی پا کر اپنے پروردگار کی ملاقات سے مشرف ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ، وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ، وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ، وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ، وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ. ﴿۲۵۱﴾

دعا کی کہ پروردگار، ہم پر صبر کا فیضان فرما اور ہمارے پاؤں جما دے اور اِن منکروں پر ہمیں غلبہ عطا کر دے۔ چنانچہ (اُن کی دعا قبول ہوئی اور) اللہ کے حکم سے اُنھوں نے (اپنے) اُن (دشمنوں) کو شکست دے دی[۶۶۴] اور جالوت کو داؤد[۶۶۵] نے قتل کر دیا اور اللہ نے اُسے بادشاہی دی اور حکمت عطا فرمائی اور اُسے اُس علم میں سے سکھایا جو اللہ چاہتا ہے (کہ اپنے اِس طرح کے بندوں کو سکھائے)[۶۶۶] ـــــ اور (حقیقت یہ کہ) اگر اللہ ایک کو دوسرے سے نہ ہٹاتا تو زمین فساد سے بھر جاتی، لیکن (اُس نے اِسی طرح ہٹایا ہے، اِس لیے کہ) اللہ دنیا والوں پر بڑی عنایت فرمانے والا ہے[۶۶۷]۔ ۲۴۹-۲۵۱

---

[۶۶۳] طالوت کے بیٹے یونتن نے یہ فقرہ غالباً اِسی موقع پر کہا ہے:

''سو یونتن نے اُس جوان سے جو اُس کا سلاح بردار تھا، کہا: آ ہم ادھر اِن نامختونوں کی چوکی کو چلیں۔ ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے، کیونکہ خداوند کے لیے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعے سے بچانے کی قید نہیں۔'' (۱-سموئیل ۱۴:۶)

[۶۶۴] یعنی اسباب و وسائل تو یقیناً اختیار کیے گئے، لیکن فتح اصلاً اللہ کے حکم ہی سے ہوئی۔ سموئیل میں ہے کہ سیدنا داؤد نے یہی بات اُس وقت کہی تھی، جب وہ میدان جنگ میں جالوت کے مقابل ہوئے:

''اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا، اِس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا۔'' (۱-سموئیل ۱۷:۴۷)

[۶۶۵] یہ وہی حضرت داؤد ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی اور جن کے فرزند بنی اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ اور نبی سیدنا سلیمان علیہ السلام ہیں۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے جالوت کو قتل کرنے کے اِس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اُن کے بارے میں لکھا ہے:

''... اِن کی ابتدا غریبانہ، لیکن انتہا نہایت شان دار ہوئی۔ اِنھوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ خداوند نے مجھے بھیڑ سالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ طالوت کی اُس فوج میں شامل تھے جس کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اِس شمولیت کے متعلق تورات میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اِس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار کی حیثیت سے اُن کے لشکر میں داخل ہو چکے تھے اور در پردہ یہ سموئیل کے ممسوح اور مستقبل کے بادشاہ بھی تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں، اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ (بنی اسرائیل بھی اِس بات کو جانتے ہیں، لیکن مانتے اِس لیے نہیں کہ) یہ جو رسول

بھائیوں کو، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے باپ کے حکم سے کچھ کھانے کی چیزیں دینے آئے۔ یہاں اِنھوں نے دیکھا کہ جالوت مقابلے کے لیے چیلنج دے رہا ہے، لیکن کوئی اُس کے مقابلے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اِن کی غیرت کو جوش آیا۔ اِنھوں نے طالوت سے اُس کے مقابلے کی اجازت مانگی۔ یہ اُس وقت ایک نوخیز، سرخ رو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو اِن کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد ہوا۔ لیکن جب اِنھوں نے کہا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں اور ریچھوں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں، بھلا اِس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے کہ یہ زندہ خداوند کی فوجوں کو رسوا کرے، تو طالوت نے اِن کے عزم و ہمت کو دیکھ کر اِن کو اجازت دے دی اور خود اپنا جنگی لباس پہنا کر اپنے مخصوص اسلحہ سے اِن کو لیس کیا۔ اُس وقت تک اِن کا زمانہ بھیڑوں بکریوں کی چرواہی میں گزرا تھا، اِس جنگی لباس اور اِن جنگی اسلحہ کا اِن کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ اِن کو پہن کر کچھ بندھا بندھا سا محسوس کرنے لگے۔ آخر طالوت کی اجازت سے اِس قید سے رہائی حاصل کی اور چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے اور وقت کے سب سے بڑے دیو کے مقابل میں جا کے ڈٹ گئے۔ پہلے تو اُس نے اِن کا مذاق اڑایا۔ لیکن جب اِن کی طرف سے اُس کو ترکی بہ ترکی جواب ملا تو اُس نے کہا کہ ''اچھا آ، آج تیرا گوشت چیلوں اور کووں کو کھلاتا ہوں۔'' اتنے میں حضرت داؤد نے فلاخن میں پتھر رکھ کر جو اُس کو مارا تو پتھر اُس کے سر سے چپک کر رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک الھڑ چرواہے کی فلاخن سے اِس طرح مارا جانا، ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔ چنانچہ فلسطینی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور اِدھر بنی اسرائیل کی عورتوں کی زبان پر یہ گیت جاری ہو گیا:

''ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا، پر داؤد نے لاکھوں کو مارا''۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۸۰)

[٦٦٦] اصل الفاظ ہیں: 'علمه مما يشاء'۔ یہاں بظاہر 'مما شاء' کا موقع تھا، مگر اِس کے بجائے یہ اسلوب اللہ تعالیٰ کے جس طریقے کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اُسے ہم نے اپنے ترجمے میں واضح کر دیا ہے۔

[٦٦٧] یہ آخر میں جنگ کا مقصد بیان کر کے بات ختم کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ظلم و عدوان کے مقابلے میں اِس کا حکم نہ دیتے تو زمین میں ایسا فساد برپا ہو جاتا کہ وہ نیکی، تقویٰ اور صلاح و فلاح کے تمام آثار سے خالی ہو جاتی۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ترغیب و تشویق ہے کہ اُنھیں بھی اب بغیر کسی تردد کے خدا کے اِس مقصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے لیے تیار ہو جانا چاہیے اور بنی اسرائیل کی تاریخ کے اِن واقعات کی روشنی میں مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ ثابت قدم رہے تو اللہ اُن کے دشمنوں پر اُنھیں اِسی طرح غلبہ عطا فرمائے گا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ: مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ، وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ، وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ، وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْم بَعْدِ هِمْ مِّنْم بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ، وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا، فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ، وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ. ﴿۲۵۳﴾

ہیں، ہم نے اِن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی، (اِس طرح کہ) اِن میں سے کسی سے اللہ خود ہم کلام ہوا[۶۶۸] اور کسی کے درجے اُس نے (بعض دوسری حیثیتوں سے) بلند کیے اور (آخر میں) مریم کے بیٹے عیسیٰ کو ہم نے نہایت واضح نشانیاں دیں اور روح القدس سے اُس کی تائید کی۔[۶۶۹] (چنانچہ یہی چیز اِن رسولوں کے ماننے والوں میں ایک دوسرے کو جھٹلانے کا باعث بن گئی)۔[۶۷۰] اور اگر اللہ چاہتا تو نہایت واضح دلائل سامنے آ جانے کے بعد یہ اُن کے بعد والے ایک دوسرے سے نہ لڑتے۔ لیکن (اللہ نے یہ نہیں چاہا کہ لوگوں پر جبر کرے، اِس لیے) اُنھوں نے اختلاف کیا۔ سو اُن میں سے کوئی (اِن رسولوں پر) ایمان لایا اور کسی نے ماننے سے انکار کر دیا۔ (تم کو نہ ماننے کی وجہ بھی یہی ہے، اے پیغمبر)، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ہرگز آپس میں نہ لڑتے، مگر اللہ (اپنی حکمت کے مطابق) جو چاہے کرتا ہے۔[۶۷۱] ۲۵۲-۲۵۳

---

[۶۶۸] اِس سے مراد وہ مخاطبۂ الٰہی ہے جس سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام براہ راست مشرف ہوئے۔ یہ اُن کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔

[۶۶۹] پرانے صحیفوں میں 'الروح القدس' سے جبریل امین مراد لیے جاتے ہیں۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے لیے روح القدس کی تائید کا ذکر اِس لیے کیا جاتا ہے کہ اُن سے جو کھلے کھلے معجزے صادر ہوئے، یہود نے اپنی بدبختی کے باعث اُنھیں بدروحوں کے سردار بعلزبول کی تائید کا نتیجہ قرار دیا۔

[۶۷۰] یعنی جس نے جس نبی اور رسول کو مانا، 'آں چہ خوباں ہمہ دارند وتو تنہا داری' کا مصداق بنا کر مانا۔ چنانچہ دوسرے کسی نبی یا رسول کے لیے کوئی فضیلت ماننا اُس کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پایا، یہاں تک کہ نوبت اللہ کے نبیوں اور رسولوں کو جھٹلانے تک پہنچ گئی۔ بنی اسرائیل کا معاملہ بھی یہی تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کے نتیجے میں خدا کی آخری ہدایت کا ماخذ آپ قرار پائیں گے اور یہ اُن کے پیغمبروں پر آپ کی فضیلت ماننے کے مترادف ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا، اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَ لَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ، وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. ﴿٢٥٤﴾

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ، لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ، لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ، مَنْ ذَاالَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ، يَعْلَمُ

ایمان والو، (تم اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ واور) جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے، اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) اُس دن کے آنے سے پہلے خرچ کرلو، جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ (کسی کی) دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی سفارش نفع دے گی۔ اور (حقیقت یہ ہے کہ اُس دن کے) منکر ہی اپنی جان پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔۲۵۴

(اُس دن معاملہ صرف اللہ سے ہوگا)۔ اللہ، جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا[۶۷۲]۔ نہ اُس کو نیند آتی ہے، نہ اونگھ لاحق ہوتی ہے[۶۷۳]۔ زمین وآسمان میں جو کچھ ہے، سب اُسی کا ہے۔ کون

---

[۶۷۱] یعنی اپنے علم اور اپنی حکمت کے مطابق جس چیز کو درست سمجھتا ہے، کرتا ہے۔ تمھاری خواہشوں سے اُس کا کوئی ارادہ تبدیل نہیں ہوسکتا۔ سو اُس نے یہی درست سمجھا کہ اِس معاملے میں بندوں کو آزادی دے کہ اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ وہ کفر وایمان میں سے جو چاہیں اختیار کرلیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”(یہ) اللہ تعالیٰ نے اُس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت وضلالت کے باب میں اُس نے پسند فرمائی ہے اور جس کا قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اُس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں جبر کا طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اِس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لیے بھی ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہ رہتی۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ بندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی سوچ سمجھ اور اپنے اختیار وارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر کی راہ اختیار کریں، چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر وہ ایمان کی راہ اختیار کریں گے تو اُس کا صلہ پائیں گے اور اگر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو اُس کا انجام دیکھیں گے۔“ (تدبر قرآن ۱/ ۵۸۳)

[۶۷۲] اصل میں لفظ ’قیوم‘ استعمال ہوا ہے۔ اِس کے معنی ہیں وہ ہستی جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کو قائم رکھنے والی ہو۔ اِس سے اور اِس سے پہلے ’حی‘ کی صفت سے قرآن نے اُن تمام معبودوں کی نفی کر دی ہے جو نہ زندہ ہیں نہ دوسروں کو زندگی دے سکتے ہیں، اور نہ اپنے بل پر قائم ہیں، نہ دوسروں کو قائم رکھنے والے ہیں، بلکہ خود اپنی زندگی اور بقا کے لیے ایک حی وقیوم کے محتاج ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡھِمۡ وَمَا خَلۡفَھُمۡ، وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ، وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ، وَ لَا یَئُوۡدُہٗ حِفۡظُھُمَا وَھُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ.﴿۲۵۵﴾

لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ، قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ، فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ

ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں کسی کی سفارش کرے۔[674] لوگوں کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے اور اُس کی مرضی کے بغیر وہ اُس کے علم میں سے کسی چیز کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے۔[675] اُس کی بادشاہی[676] زمین اور آسمانوں پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی حفاظت اُس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوتی،[677] اور وہ بلند ہے، بڑی عظمت والا ہے۔[678] ۲۵۵

(یہ جو رویہ چاہیں، اختیار کریں)، دین کے معاملے میں (اللہ کی طرف سے) کوئی جبر نہیں ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) ہدایت (اِس قرآن کے بعد اب) گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے۔ لہٰذا جس

---

[۶۷۳] اِس نفی سے نیند کی ابتدا اور انتہا، دونوں کی نفی کی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے اثرات سے بالکل آخری درجے میں پاک ہے۔

[۶۷۴] یعنی جب اُس کی خدائی میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے تو پھر کس کی مجال ہے کہ اُس کی اجازت کے بغیر اُس کے حضور میں سفارش کی جسارت کرے۔

[۶۷۵] یعنی جب لوگوں کے ماضی اور مستقبل کی ہر چیز سے وہ خود واقف ہے اور کوئی دوسرا اُس کے علم کے کسی حصے کو اُس کی مرضی کے بغیر اپنی گرفت ادراک میں بھی نہیں لے سکتا تو سفارش کس بنا پر کی جائے گی؟ کیا کوئی شخص اِس لیے سفارش کرے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہے؟

[۶۷۶] اصل میں لفظ 'کرسی' آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ اقتدار کی تعبیر ہے۔ ہماری اردو میں بھی یہ لفظ اِس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

[۶۷۷] چنانچہ اُن کو سنبھالنے کے لیے اُسے کسی سہارے کی ضرورت پیش نہیں آتی کہ اِس بنا پر کوئی اُس کا شریک و سہیم سمجھا جائے۔

[۶۷۸] لہٰذا اُس کے علم اور اُس کی قدرت کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی صفات کے بارے میں جو کچھ وہ خود بتائے، صرف اُسی کو ماننا کافی ہے۔ اِس معاملے میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے۔ دین میں بے روح

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ، فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى، لَا انْفِصَامَ لَهَا ، وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ.﴿٢٥٦﴾

نے شیطان[٦٧٩] کا انکار کیا اور اللہ کو مانا تو اُس نے گویا نہایت مضبوط رسی پکڑ لی جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتی۔ اور (یہ اِس لیے کہ) اللہ سمیع و علیم ہے۔ ٢٥٦

فلسفیانہ مباحث اور شرک و بدعت کی راہیں اِسی سے کھلتی ہیں۔

[٦٧٩] اصل میں لفظ 'الطاغوت' آیا ہے، یعنی وہ جو خدا کے سامنے سرکشی، تمرد اور استکبار اختیار کرے۔ اِس میں اور 'الشیطان' میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن میں یہ دونوں بالکل ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نماز عصر کا وقت

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

روی[1] انه کانت عائشة تقول: ان رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم کان یصلی العصر، والشمس فی حجرتها قبل ان تظهر[2].

روایت ہوا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے جب سورج سیدہ کے کمرے میں (دیوار پر) چڑھنے سے پہلے (فرش پر) ہوتا تھا[1]۔

ترجمے کے حواشی

[۱] بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ وقت ہے جب سورج نصف النہار اور غروب کی حالت کے درمیان میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت سورج کی روشنی سیدہ کے کمرے کی دیواروں کے بجائے اس کے فرش پر ہوتی تھی۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ مسلم کی روایت، رقم ۶۱۱ ہے۔ معمولی اختلاف کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بخاری، رقم ۴۹۹، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۲۹۳۶۔ مسلم، رقم ۶۱۱۔ موطا، رقم ۲۔ ترمذی، رقم ۱۵۹۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۷۔ النسائی، رقم ۵۰۵۔ ابن ماجہ، رقم ۶۸۳۔ ابن خزیمہ، رقم ۳۳۲۔ ابن حبان، رقم ۱۴۵۰، ۱۵۲۱۔ احمد ابن حنبل، رقم ۲۴۱۴۱، ۲۴۵۹۸، ۲۵۶۷۷، ۲۵۷۲۶، ۲۶۴۲۱۔ سنن الکبریٰ، رقم ۱۴۹۴۔ بیہقی، رقم ۱۹۲۰، ۱۹۱۹، ۱۹۱۸، ۱۵۸۰۔ دارمی، رقم ۱۱۸۶۔ مسند ابویعلیٰ، رقم ۴۴۸۰، ۴۴۲۰۔ عبدالرزاق، رقم ۲۰۷۳، ۲۰۷۲، ۲۰۷۱۔ الحمیدی، رقم ۱۷۰۔ مسلم، رقم ۶۱۱۔

۲۔ 'والشمس فی حجرتھا قبل ان تظھر' (سورج ان کے کمرے میں دیوار پر چڑھنے سے پہلے فرش پر ہوتا تھا) کا جملہ متعدد روایات میں مختلف انداز سے روایت ہوا ہے۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۱۹ میں 'والشمس لم تخرج من حجرتھا' (سورج ان کے کمرے سے نہیں نکلا تھا) کا اسلوب ہے۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۲۰ میں 'والشمس فی حجرتھا لم یظھر الفیٔ من حجرتھا' (جب سورج ان کے کمرے میں تھا اور سائے ظاہر نہیں ہوئے تھے) کا جملہ نقل ہوا ہے۔ بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۵۲۱ میں یہ الفاظ آئے ہیں: 'والشمس طالعة فی حجرتی لم یفیٔ الفیٔ بعد' (جب سورج میرے کمرے میں چمک رہا تھا اور سایہ ابھی ظاہر نہیں ہوا تھا)۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۶۱۱ (ب) میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: 'والشمس طالعة فی حجرتی لم یفی الفیٔ بعد' (جب سورج میرے کمرے میں چمک رہا تھا اور سایہ ابھی بڑھا نہیں تھا)۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۶۱۱ (ج) میں 'والشمس فی حجرتھا لم یظھر الفیٔ فی حجرتھا' (جب سورج ان کے کمرے میں تھا اور کمرے میں سائے ظاہر نہیں ہوئے تھے) کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً مسلم، رقم ۶۱۱ (د) میں یہ بات ان الفاظ میں آئی ہے: 'والشمس واقعة فی حجرتی' (جب سورج میرے کمرے میں تھا)۔ بعض روایات مثلاً ابن ماجہ، رقم ۳۸۳ میں 'والشمس فی حجرتی لم یظھرھا الفیٔ بعد' (جب سورج میرے کمرے میں تھا اور ابھی سائے اس پر نہیں پھیلے تھے۔) کا جملہ نقل ہوا ہے۔ بعض روایات مثلاً احمد ابن حنبل، رقم ۲۵۶۷۷ کے الفاظ یہ ہیں: 'قبل ان تخرج الشمس من حجرتی طالعة' (سورج کے میرے کمرے میں سے نکلنے سے پہلے) کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۱۸ میں 'والشمس فی حجرتھا قبل ان تظھر الشمس' (جب سورج دیوار پر چڑھنے سے پہلے

ان کے کمرے میں تھا)۔ بعض روایات مثلاً بیہقی ۱۹۲۰ میں 'و الشمس فی قعر حجرتی '(جب سورج ان کے کمرے کے فرش پر تھا) کے الفاظ آئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً مسند ابو یعلیٰ، رقم ۴۴۸۰ 'و الشمس طالعة فی حجرتی '(جب سورج میرے کمرے میں چمک رہا تھا) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ بعض روایات مثلاً مسند الحمیدی، رقم ۱۷۰ کے الفاظ یہ ہیں: 'و الشمس طالعة فی حجرتی لم یظهر الفیٔ علیها بعد '(جب سورج میرے کمرے میں چمک رہا تھا اور سائے ابھی کمرے پر غالب نہیں آئے تھے)۔ بعض روایات مثلاً عبدالرزاق، رقم ۲۰۷۳ کا جملہ یہ ہے: 'و الشمس فی حجرتها قبل ان تظهر و لم یظهر الفیٔ من حجرتها '(جب سورج دیواروں پر چڑھنے سے پہلے ان کے کمرے میں تھا اور سائے ان کے کمرے میں ظاہر نہیں ہوئے تھے)۔

جملے کی روایت کے بارے میں ان اختلافات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیدہ عائشہ کی بات کے فہم اور تاویل میں کس قدر مختلف آرا موجود ہیں۔ چنانچہ متعین طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ام المومنین نے اصل میں کیا الفاظ ارشاد فرمائے تھے۔ ہم نے مسلم، رقم ۶۱۱ (ا) کے الفاظ کو اس بنا پر ترجیح دی ہے کہ یہ جملہ کافی حد تک مذکورہ بات کے مختلف پہلوؤں کا جامع ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۱)

دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ اس کے منتہاے کمال تک پہنچنے کا ذریعہ انسان کا اپنے پروردگار سے تعلق ہے۔ یہ تعلق جتنا محکم ہوتا ہے، انسان اپنے علم و عمل کی پاکیزگی میں اتنا ہی ترقی کرتا ہے۔ محبت، خوف، اخلاص و وفا اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں اور بے نہایت احسانات کے لیے احساس واعتراف کے جذبات، یہ اس تعلق کے باطنی مظاہر ہیں۔ انسان کے شب و روز میں اس کا ظہور بالعموم تین ہی صورتوں میں ہوتا ہے: پرستش، اطاعت اور حمیت و حمایت۔ انبیا علیہم السلام کے دین میں عبادات اسی تعلق کی یاددہانی کے لیے مقرر کی گئی ہیں۔ نماز پرستش ہے، روزہ اور اعتکاف اطاعت، اور حج و عمرہ اور قربانی اللہ تعالیٰ کے لیے حمیت و حمایت کا علامتی اظہار ہیں۔

ہم یہاں انھی عبادات سے متعلق شریعت کے احکام کی وضاحت کریں گے۔

نماز

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا. (النساء ۴: ۱۰۳)

''بے شک، نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔''

اسلام کی عبادات میں اہم ترین عبادت نماز ہے۔ دین کی حقیقت، اگر غور کیجیے تو معبود کی معرفت اور اس کے حضور میں

خوف ومحبت کے جذبات کے ساتھ خضوع وتذلل ہی ہے۔ اس حقیقت کا سب سے نمایاں ظہور پرستش ہے۔ تسبیح وتحمید، دعا و مناجات اور رکوع وسجود اس پرستش کی عملی صورتیں ہیں۔ نماز یہی ہے اور ان سب کو غایت درجہ حسن توازن کے ساتھ اپنے اندر جمع کر لیتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دوام ذکر، یعنی ہمہ وقت اپنی یاد میں رہنے کا حکم دیا ہے: 'یا ایھا الذین امنوا، اذکروا اللّٰہ ذکراً کثیراً و سبحوہ بکرۃ و اصیلاً'[1] (ایمان والو، اللہ کو بہت زیادہ یاد کیا کرو اور صبح وشام اس کی تسبیح کرتے رہو)۔ اس کی بہترین صورت نماز ہے، اس لیے کہ بندہ اس میں پورے وجود کے ساتھ اپنے پروردگار کو یاد کرتا، بلکہ اس یاد کی عملی تصویر بن جاتا ہے۔ چنانچہ دن رات میں پانچ وقت یہ اسی یاد کو قائم رکھنے کے لیے لازم کی گئی ہے۔ قرآن میں ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو نبوت دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّکَ ، فَاخۡلَعۡ نَعۡلَیۡکَ ، اِنَّکَ بِالۡوَادِ الۡمُقَدَّسِ طُوًی، وَاَنَا اخۡتَرۡتُکَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا یُوۡحٰی، اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ، وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ. (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۔۱۴)

''یہ میں تمھارا پروردگار ہوں، سو جوتیاں اتار دو، اس لیے کہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور (جان لو کہ) میں نے تمھیں نبوت کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ لہٰذا جو کچھ وحی کیا جائے، اس کو سنو۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ سو میرے بندے بن کر رہو اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھو۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نماز کی اہمیت

دین میں نماز کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ چند باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

۱۔ نماز دین کا اولین حکم ہے۔ ایمانیات میں جو حیثیت توحید کی ہے، وہی اعمال میں نماز کی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آیات الٰہی کی تذکیر سے خدا کی جو معرفت حاصل ہوتی اور اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور شکر گزاری کے جو جذبات انسان کے اندر پیدا ہوتے ہیں یا ہونے چاہییں، ان کا پہلا ثمرہ یہی نماز ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّمَا یُؤۡمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیۡنَ اِذَا ذُکِّرُوۡا بِہَا، خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوۡا بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ ، وَہُمۡ لَا یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ. تَتَجَافٰی جُنُوۡبُہُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ ، یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ خَوۡفاً وَّ طَمَعاً ، وَّ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ. (السجدہ ۳۲: ۱۵۔۱۶)

''ہماری آیتوں پر تو صرف وہی ایمان لاتے ہیں جن کا معاملہ یہ ہے کہ جب اُن کے ذریعے سے انھیں یاد دہانی کی جاتی ہے تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور سرکشی کا رویہ اختیار نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں۔

---

[1] الاحزاب ۳۳: ۴۱۔۴۲۔

وہ اپنے پروردگار کو خوف و طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں بخشا ہے، اُس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔''

یہی بات سورۂ روم کی ان آیات سے بھی واضح ہوتی ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا، فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا، لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ، ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ. مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ، وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (۳۰:۳۰-۳۱)

''چنانچہ ہر طرف سے یک سو ہو کر اپنا رخ اِس دین کی طرف کر لو۔ (اور اِس طرح) اللہ کی بنائی ہوئی اُس فطرت کی پیروی کرو جس پر اُس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی اس فطرت میں کوئی تبدیلی جائز نہیں ہے۔ یہی سیدھا دین ہے، مگر زیادہ لوگ نہیں جانتے۔ (اس پر قائم ہو جاؤ) اللہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو کر اور اُسی سے ڈرو اور نماز کا اہتمام رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کا ستون[۲] قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں جہاں اجمال کا اسلوب ملحوظ ہے، وہاں تو بے شک، ایمان کے بعد 'عملوا الصلحات' کے الفاظ آئے ہیں، لیکن جہاں اس اجمال کی تفصیل پیش نظر ہے، وہاں سب سے پہلے نماز ہی کا ذکر کیا گیا ہے:

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ، وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ. (البقرہ ۲:۳)

''یہ جو بن دیکھے مان رہے ہیں اور نماز کا اہتمام کر رہے ہیں۔''

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ. (البقرہ ۲:۲۷۷)

''ہاں، جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور نماز کا اہتمام کیا۔''

تزکیہ جسے قرآن میں دین کا مقصد قرار دیا گیا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے بھی سب سے پہلے اسی کی ہدایت ہوئی ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى. (الاعلیٰ ۸۷:۱۴-۱۵)

''(اُس وقت)، البتہ کامیاب ہوا جس نے اپنا تزکیہ کیا اور (اِس کے لیے) اپنے پروردگار کا نام یاد کیا اور نماز پڑھی۔''

اسی طرح قرآن نے جن مقامات پر ان اعمال کا ذکر کیا ہے جو قیامت میں فوز و فلاح کے لیے ضروری ہیں، وہاں بھی ابتدا نماز ہی سے کی ہے۔

۲۔ ترمذی، رقم ۲۶۱۶۔

سورۂ مومنون میں ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ، الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوۡنَ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ... وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَ عَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ. (۲۳:۱-۹)

''فلاح پا گئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں فروتنی اختیار کرنے والے ہیں اور جو لغویات سے دور رہنے والے ہیں، اور جو زکوٰۃ کا اہتمام کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں ... اور جو (خلق اور خالق ، دونوں کے معاملے میں) اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرنے والے ہیں، اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

سورۂ معارج میں ہے:

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعاً، اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعاً، وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعاً، اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ، وَالَّذِیۡنَ فِیۡ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ، وَالَّذِیۡنَ یُصَدِّقُوۡنَ بِیَوۡمِ الدِّیۡنِ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ مِّنۡ عَذَابِ رَبِّهِمۡ مُّشۡفِقُوۡنَ ، اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمۡ غَیۡرُ مَاۡمُوۡنٍ ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ... وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ بِشَهٰدٰتِهِمۡ قَآئِمُوۡنَ، وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ، اُولٰٓئِكَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّکۡرَمُوۡنَ. (۷۰:۱۹-۳۵)

''حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت بے صبرا پیدا ہوا ہے۔ (یہ اگر اپنی تربیت نہ کرے تو بے شک یہی ہوتا ہے کہ) اِس پر جب مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب راحت ملتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو نمازی ہیں۔ جو ہمیشہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں، اور جن کے مالوں میں سائل و محروم کے لیے ایک مقرر حق ہے، اور جو روز جزا کو برحق مانتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں ـــــ اس میں شبہ نہیں کہ اُن کے پروردگار کا عذاب نڈر رہنے کی چیز ہی نہیں ہے ـــــ اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں... اور جو (خلق اور خالق، دونوں کے معاملے میں) اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، اور جو اپنی گواہی پر قائم رہتے ہیں، اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی ہیں جو بہشت کے باغوں میں ہوں گے، بڑی عزت کے ساتھ۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اعمال میں کیا چیز اللہ کو سب سے زیادہ

پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: وقت کی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا۔[3]

سیدنا عمر نے اپنے عمال کے نام ایک خط میں لکھا ہے: تمھارے دینی معاملات میں میرے نزدیک سب سے اہم نماز ہے۔ جو اس کی حفاظت کرے گا، وہ پورے دین کی حفاظت کرے گا، اور جو اسے ضائع کر دے گا، وہ باقی دین کو سب سے بڑھ کر ضائع کر دے گا۔[4]

۲۔ نماز آدمی کے مسلمان سمجھے جانے کی شرائط میں سے ہے۔ قرآن نے یہ بات پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دی ہے کہ مسلمانوں کی ریاست میں صرف وہی لوگ مسلمان کی حیثیت سے حقوق کا مطالبہ کر سکیں گے جو نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ سورۂ توبہ میں مشرکین عرب کے خلاف کارروائی کے موقع پر اعلان فرمایا ہے:

فَاِنۡ تَابُوۡا، وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ، وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ، فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ. (۹:۱۱)

''پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمھارے بھائی ہوں گے۔''

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قیامت میں بھی لوگوں کے ساتھ یہی معاملہ ہونا چاہیے۔ سورۂ قیامہ میں قرآن نے نہایت بلیغ اسلوب میں اسے واضح کر دیا ہے:

فَلَاصَدَّقَ وَلَاصَلّٰی، وَلٰکِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی، ثُمَّ ذَہَبَ اِلٰۤی اَہۡلِہٖ یَتَمَطّٰی، اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی، ثُمَّ اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی. (۷۵:۳۱۔۳۵)

''لیکن (اِس انسان کو دیکھو)، اِس نے نہ تو (قیامت کے اچھے انجام کو) سچ مانا، نہ نماز پڑھی، بلکہ جھٹلا دیا اور منہ موڑا۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں میں چل دیا۔ پھر افسوس ہے، تجھ پر افسوس ہے۔ پھر افسوس ہے، تجھ پر افسوس ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس میں 'صلی' کے مقابل میں 'تولی' اور 'ثم ذهب الیٰ اهله یتمطی' کے الفاظ سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نماز کو یہ حیثیت اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ کے نزدیک نماز نہ پڑھنا درحقیقت بندے کا خدا کے مقابلے میں استکبار ہے اور قرآن نے دوسری جگہ بتا دیا ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو سکتا ہے، لیکن مستکبرین جنت میں داخل نہیں ہو سکتے۔[5]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بین الرجل و بین الکفر و الشرك ترك الصلوٰة. (مسلم، رقم ۱۳۴)

''آدمی کے کفر و شرک اور ایمان کے درمیان حد فاصل نماز چھوڑ دینا ہے۔''

۳؎ بخاری، رقم ۵۲۷۔

۴؎ الموطا، رقم ۶۔

۵؎ الاعراف ۷:۴۰۔

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے:

خمس صلوٰت افترضهن اللّٰه تعالیٰ : من احسن وضوء هن ، وصلاهن لوقتهن واتم رکوعهن وخشو عهن ، کان له علی الله عهد ان یغفر له، ومن لم یفعل، فلیس له عهد، ان شاء غفرله وان شاء عذبه. (ابوداؤد، رقم ۴۲۵)

''یہ پانچ نمازیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض کیا ہے: جس نے ان کے لیے اچھے طریقے سے وضو کیا، انھیں وقت پر ادا کیا اور اپنا ظاہر و باطن ان میں پوری طرح اپنے پروردگار کے سامنے جھکا دیا، اس کے لیے اللہ کا عہد ہے کہ اُسے بخش دے گا اور جس نے یہ نہیں کیا، اُس کے لیے کوئی عہد نہیں ہے۔ اللہ چاہے گا تو اُسے بخشے گا اور چاہے گا تو عذاب دے گا۔''

۳۔ نماز دین پر قائم رہنے کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد سے غافل ہو جاتے اور اس سے اعراض کر لیتے ہیں، اُن پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو شب و روز کے لیے ان کا ساتھی بن جاتا ہے: 'ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض له شیطاناً فهوله قرین'[۶]۔ نماز اسی غفلت اور اعراض سے انسان کو بچاتی اور شیطان سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی جو آیات اوپر نقل ہوئی ہیں، ان میں دیکھ لیجیے، جن باتوں کی ابتدا نماز سے ہوئی ہے، ان کا خاتمہ بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ اس سے یہ اشارہ صاف نکلتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی ہے جو انسان کے دین پر قائم رہنے کی ضمانت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شیطان کے حملے اس کے بعد بھی جاری رہتے ہیں، لیکن نماز پر مداومت کے نتیجے میں اس کے لیے مستقل طور پر انسان کے دل میں ڈیرے ڈال دینا ممکن نہیں ہوتا، نماز اسے مسلسل دور بھگاتی اور ایک حصار کی طرح اس کے حملوں سے انسان کے دل و دماغ کی حفاظت کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطرے کی حالت میں بھی تاکید کی گئی ہے کہ پیدل یا سواری پر، جس طرح ممکن ہو، اسے لازماً ادا کیا جائے۔ سورۂ بقرہ میں قانون و شریعت کی فصل کے خاتمے پر یہ حقیقت اس طرح بیان فرمائی ہے:

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰی وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ . فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّالَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ.

(۲:۲۳۸۔۲۳۹)

''نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص اُس نماز کی جو (دن اور رات کی نمازوں کے) درمیان میں آتی ہے، (جب تمھارے لیے اپنی مصروفیتوں سے نکلنا آسان نہیں ہوتا)، اور (سب کچھ چھوڑ کر) اللہ کے حضور میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ پھر اگر خطرے کا موقع ہو تو پیدل یا سواری پر، جس طرح چاہے پڑھ لو۔ لیکن جب امن ہو

۶؎ الزخرف ۴۳:۳۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جائے تو اللہ کو اسی طریقے سے یاد کرو جو اُس نے تمھیں سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے تھے۔''

سورۂ مریم میں قرآن نے اسی بنا پر شہوات کی پیروی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ گویا وہ نمازیں ضائع کر دینے کا لازمی نتیجہ ہے: 'فخلف من بعدھم خلف، اضاعوا الصلوٰۃ، واتبعوا الشھوات'[7] (پھر اُن کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف اٹھے جنھوں نے نماز ضائع کر دی اور خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے)۔ سورۂ عنکبوت میں اس سے واضح تر الفاظ میں فرمایا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ، اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ. (۲۹:۴۵)

''اور نماز کا اہتمام کرو، اس لیے کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے۔''

یعنی ایک واعظ کی طرح نماز آدمی کو متنبہ کرتی ہے کہ جذبات کے غلبے، شہوات کی یورش اور خواہشوں کے ہجوم میں اسے یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے اور اس کے روبرو کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''جو لوگ نماز اس کے آداب و شرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں، خواہ خلوت کی نماز ہو یا جلوت کی، ان کی نماز اپنے ظاہر و باطن دونوں سے، ان کو ان حقائق کی یاد دہانی کرتی رہتی ہے جن کی یاد دہانی زندگی کو صحیح شاہ راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر خلوت کی نمازیں انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کی مثال اس ڈرائیور کی ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چلاتو رہا ہے، لیکن اس کی رہنمائی کے لیے داہنے بائیں جو نشانات اس کو صحیح راہ بتانے اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں، ان سے بالکل بے پروا اور بے خبر ہے۔ ایسا ڈرائیور، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی گاڑی کس کھڈ میں گرائے۔'' (تدبر قرآن ۶/ ۵۳)

۴۔ نماز گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ بندہ جب صحیح شعور کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو خدا کے ساتھ اپنے عہد کی تجدید کرتا ہے کہ وہ اس کی معصیت سے اجتناب کرے گا۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک نماز سے دوسری نماز تک کی لغزشوں پر لازماً ندامت محسوس کرتا اور ان سے بچنے کے لیے ایک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ زندگی کی مصروفیتوں کی طرف لوٹتا ہے۔ غور کیجیے تو توبہ کی حقیقت بھی یہی ہے اور توبہ کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ بندے کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ، اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ، ذٰلِکَ ذِکْرٰی لِلذّٰکِرِیْنَ. (ہود ۱۱:۱۱۴)

''اور نماز کا اہتمام کرو دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصے میں بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ایک یاد دہانی ہے اُن کے لیے جو

---

[7] مریم ۱۹:۵۹۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یاد دہانی حاصل کرنے والے ہوں۔‘‘

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہائے تو کیا اس کے جسم پر میل نام کی کوئی چیز باقی رہ جائے گی؟ لوگوں نے عرض کیا: اس صورت میں تو یقیناً میل کا کوئی شائبہ باقی نہ رہے گا۔ آپ نے فرمایا: یہ پانچ نمازوں کی مثال ہے۔ اللہ ان کے ذریعے سے بالکل اسی طرح گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔[8]

۵۔ نماز مشکل کشا ہے۔ یہود کو جب قرآن نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا عہد از سرنو استوار کرنے کی دعوت دی تو اس کی ذمہ داریوں کے تحمل کے لیے نماز ہی کے ذریعے سے مدد چاہنے کی ہدایت فرمائی۔[9] بعینہٖ یہی معاملہ بنی اسمٰعیل کے اہل ایمان کے ساتھ ہوا۔ چنانچہ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا، اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ، اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (البقرہ ۲:۱۵۳)

’’ایمان والو، صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معاندین اور اشرار کی دل آزاریوں اور شرارتوں کے مقابلے میں صبر و استقامت کے لیے اسی کی تلقین کی گئی:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ، وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ، وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ، وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ. (قٓ ۵۰: ۳۹۔۴۰)

’’سو جو کچھ یہ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، سورج کے نکلنے اور اُس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات میں بھی اُس کی تسبیح کرو اور سورج کے سربسجود ہو جانے کے بعد بھی۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس کے معنی یہ ہیں کہ نماز اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو آپ نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔[10] لوگوں نے بارش کے لیے درخواست کی تو آپ نماز پڑھ کر اس کے لیے دست بدعا ہوئے۔ سورج اور چاند گرہن کے موقع پر اللہ کی گرفت کا اندیشہ محسوس ہوا تو آپ نے نماز پڑھی۔ بدر و احزاب کے معرکوں میں مسلمان اپنے دشمنوں کے مقابلے میں صف آرا ہوئے تو آپ نے اسی کا سہارا لیا اور اسی کے ذریعے سے اپنے پروردگار کی مدد چاہی۔

۸؎ بخاری، رقم ۵۲۸۔

۹؎ البقرہ ۲:۴۵۔

۱۰؎ تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۱/۸۷۔

۶۔نماز دعوت حق کی پہچان ہے۔قرآن نے بتایا ہے کہ اس کے نزدیک مصلحین وہی ہیں جو کتاب الٰہی کو اللہ تعالیٰ کے میثاق اورحق و باطل کے لیے میزان کی حیثیت سے پوری مضبوطی کے ساتھ تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ارشادفرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ، اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَالْمُصْلِحِيْنَ. (الاعراف ۷:۱۷۰)

''اور جو اللہ کی کتاب کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم کر رکھی ہے، (وہی اصلاح کرنے والے ہیں، اور) ان اصلاح کرنے والوں کا اجر ہم کبھی ضائع نہ کریں گے۔''

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''قرآن حکیم کا یہ بیان تجدید دین و اصلاح ملت کی تمام تحریکات اور تمام دعوتوں کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی فراہم کرتا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہ دعوت یا تحریک اصلاح ملت کی صحیح دعوت یا تحریک ہے جس کے مبدأ و معاد، جس کی ابتدا اور انتہا، جس کے عقیدہ اور عمل، جس کے نصب العین اور پروگرام، دونوں میں نماز اور اقامت نماز کو وہی اولیت اور اہمیت حاصل ہو جو اللہ کے عہد اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں فی الواقع از روئے قرآن اس کو حاصل ہے۔جس دعوت یا تحریک میں نماز کو یہ اولیت و اہمیت حاصل نہ ہو، وہ تجدید دین اور اصلاح ملت کے نقطۂ نظر سے ایک بے برکت ، بلکہ لاحاصل کام ہے، کیونکہ وہ ریڑھ کی اس ہڈی سے بھی محروم ہے جس پر تجدید دین کی دعوت کا قالب کھڑا ہوتا ہے اور اس روح سے بھی محروم ہے جس سے اس قالب کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۲۰۳)

۷۔نماز راہ حق میں استقامت کا ذریعہ ہے۔بالبداہت واضح ہے کہ اس راہ میں استقامت خدا کی معیت سے حاصل ہوتی ہے اور نماز خدا سے اس درجہ قریب ہے کہ وہ دنیا میں گویا ہمارے لیے خدا کی قائم مقام ہے۔سورۂ علق کی آیت 'واسجدو اقترب'[۱۱] (سجدہ ریز رہو اور اس طرح میرے قریب ہو جاؤ) میں یہی حقیقت واضح فرمائی ہے۔لہٰذا اللہ کی راہ میں جدوجہد کے لیے اللہ کی معیت اگر حاصل ہو سکتی ہے تو اس کی کتاب اور اس کے حضور میں نماز ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ اہمیت قیام اللیل، یعنی نماز تہجد کی ہے۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب انذار عام کا حکم ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قول ثقیل کا تحمل اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا مقصود ہے تو رات کی نمازوں میں قرآن کی تلاوت کی جائے۔اس کی وجہ یہ بتائی کہ یہ وقت دل و دماغ کے فراغ اور فہم قرآن کے لیے سب سے زیاہ موزوں ہے۔استاذ امام کے الفاظ میں یہ وقت چونکہ دماغ کے سکون اور دل کی بیداری کا خاص وقت ہے، اس وجہ سے زبان سے جو بات نکلتی ہے، تیر بہ ہدف اور 'از دل خیزد بر دل ریزد' کا مصداق بن کر نکلتی ہے۔آدمی خود بھی اس کو اپنے دل کی گواہی کی طرح

---

[۱۱] العلق ۹۶:۱۹۔

قبول کرتا ہے اور دوسرے سننے والوں پر بھی اس کی تاثیر بے خطا ہوتی ہے[12]۔ ارشاد فرمایا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ، قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ، نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ، اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا . اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ، اِنَّ نَاشِئَةَ الَّیْلِ هِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ، اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا ، وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا . (المزمل ۷۳: ۱۔۸)

''اے اوڑھ لپیٹ کر بیٹھنے والے، رات کو کھڑے رہو، مگر تھوڑا۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم کر لو یا اس پر کچھ بڑھا دو، اور (اپنی اِس نماز میں) قرآن کو ٹھیر ٹھیر کر پڑھو۔ اِس لیے کہ عنقریب ایک بھاری بات کا بوجھ، (اس قوم کو انذار عام کا بوجھ) ہم تم پر ڈال دیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ رات کا اٹھنا دل کی جمعیت اور بات کی درستی کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اِس لیے کہ دن میں تو (اس کام کی وجہ سے) تمھیں بہت مصروفیت رہے گی۔ (لہٰذا اِس وقت پڑھو) اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو، اور (رات کی اس تنہائی میں) سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو۔''

بعض روایتوں میں ہے کہ اس دنیا کی طرف اللہ تعالیٰ کی خاص توجہ کا وقت بھی یہی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر رات ہمارے اس قریبی آسمان کی طرف نزول فرماتے ہیں، یہاں تک کہ جب ایک تہائی رات باقی رہ جاتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے: کون دعا کر رہا ہے کہ میں اسے قبول کروں؟ کون مانگتا ہے کہ اسے دوں؟ کون مغفرت چاہتا ہے کہ اسے بخش دوں[13]؟

۸۔ نماز کائنات کی فطرت ہے۔ انسان کی آنکھیں ہوں اور وہ ان سے دیکھتا بھی ہو تو اس حقیقت کو سمجھنے میں اسے کوئی تردد نہیں ہوتا کہ اس عالم کا ذرہ ذرہ فی الواقع اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید کرتا اور اس کے سامنے سجدہ ریز رہتا ہے۔ وہ اگرچہ اس تسبیح وتحمید کو نہیں سمجھتا، مگر دیکھ تو سکتا ہے کہ دنیا کی سب چیزوں کا ظاہر جس طرح ہر لحظہ خدا کے سامنے سرافگندہ اور اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہے، ان کا باطن بھی اس سے مختلف نہیں ہوسکتا۔ زمین پر چلتے ہوئے جانور، باغوں میں لہلہاتے ہوئے درخت، فضاؤں میں چہکتے ہوئے پرندے، سمندروں میں تیرتی ہوئی مچھلیاں اور آسمان پر چمکتے ہوئے تارے اور سورج اور چاند، سب اپنے وجود سے اس بات کی گواہی دیتے ہیں:

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ، وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ،

''ساتوں آسمان اور زمین اور وہ سب چیزیں جو آسمان و زمین میں ہیں، اُس کی تسبیح کرتی ہیں۔ اور کوئی چیز بھی نہیں

۱۲۔ تدبر قرآن ۹/۲۵۔

۱۳۔ بخاری، رقم ۱۱۴۵۔

وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ . (بنی اسرائیل ۱۷:۴۴)

ہے جو حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔''

یہ سب اپنی اپنی نماز اور تسبیح سے پوری طرح واقف ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے۔ انسان دیکھے تو دیکھ سکتا ہے کہ پرندے جب پر پھیلائے ہوئے فضاؤں میں محو پرواز ہوتے ہیں تو خدا کے سامنے کمال عجز کے ساتھ گویا بچھے ہوئے ہوتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ، كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِيْحَهٗ ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِمَا يَفْعَلُوْنَ. (النور ۲۴:۴۱)

''دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کرتے ہیں وہ سب جو آسمان و زمین میں ہیں اور (فضاؤں میں) پر پھیلائے ہوئے پرندے بھی۔ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کو جانتا ہے اور جو کچھ یہ کرتے ہیں، اللہ اس سے پوری طرح واقف ہے۔''

استاذ امام لکھتے ہیں:

''اس کائنات کی ہر چیز اپنی تکوینی حیثیت میں ابراہیمی مزاج رکھتی ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ اور چوپائے سب خدا کے امر وحکم کے تحت مسخر ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی سر مو خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین سے انحراف نہیں اختیار کرتی۔ سورج، جس کو نادانوں نے معبود بنا کر سب سے زیادہ پوجا ہے، خود اپنے وجود سے گواہی دے رہا ہے کہ وہ شب و روز اپنے رب کے آگے قیام، رکوع اور سجدے میں ہے۔ طلوع کے وقت وہ سجدے سے سر اٹھاتا ہے، دوپہر تک وہ قیام میں رہتا ہے، زوال کے بعد وہ رکوع میں جھک جاتا ہے اور غروب کے وقت وہ سجدے میں گر جاتا ہے اور رات بھر اسی سجدے کی حالت میں رہتا ہے۔ اسی حقیقت کا مظاہرہ چاند اپنے عروج ومحاق سے اور ستارے اپنے طلوع وغروب سے کرتے ہیں۔ پہاڑوں، درختوں اور چوپایوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں سے ہر چیز کا سایہ ہر وقت قیام، رکوع اور سجود میں رہتا ہے اور غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی نظر آئے گی کہ اس سایے کی فطرت ایسی ابراہیمی ہے کہ یہ ہمیشہ آفتاب کی مخالف سمت میں رہتا ہے۔ اگر سورج مشرق کی سمت میں ہے تو سایہ مغرب کی جانب پھیلے گا اور اگر مغرب کی جانب ہے تو ہر چیز کا سایہ مشرق کی طرف پھیلے گا۔ گویا ہر چیز کا سایہ اپنے وجود سے ہمیں اس بات کی تعلیم دے رہا ہے کہ سجدہ کا اصل سزاوار آفتاب نہیں، بلکہ خالق آفتاب ہے۔''
(تدبر قرآن ۵/۲۲۹)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ارشاد فرمایا ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ، يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ، سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ، وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ

''اور کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے جو چیزیں بھی پیدا کی ہیں، ان کے سایے دائیں اور بائیں سے اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں اور ان پر فروتنی ہوتی ہے۔ اور زمین و آسمان میں جتنے جانور اور فرشتے ہیں وہ بھی اللہ

وَّالْمَلٰٓئِكَةُ، وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ. (النحل ۱۶: ۴۸۔۴۹)

کے آگے سربسجود ہیں اور کبھی سرکشی نہیں کرتے۔''

چنانچہ انسان جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو گویا پورے عالم کی طرف سے تسبیح وتحمید اور رکوع وسجود کی اس دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کا ساز اس ساز سے ہم آہنگ کر دیتا ہے اور اپنے اس عمل سے اعلان کرتا ہے کہ وہ بھی کسی سے پیچھے نہ رہے گا اور اپنا جسم ہی نہیں، روح بھی اس پروردگار کے حضور میں جھکا دے گا جس نے اسے پیدا کیا ہے۔ ساری کائنات سے الگ ہو کر وہ ایسی کوئی راہ نہیں نکالے گا جس میں اس کا کوئی ہم سفر نہیں ہے اور اگر ہیں تو وہی ہیں جن کے لیے خدا کا عذاب لازم ہو چکا ہے:

اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ، وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ، وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ، وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ. (الحج ۲۲: ۱۸)

''دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کے سامنے سربسجود ہیں وہ سب جو زمین و آسمان میں ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی، اور بہت سے وہ ہیں کہ جن کے لیے عذاب لازم ہو چکا ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۹۔ نماز ہی حقیقی زندگی ہے۔ انبیا علیہم السلام جو دعوت لے کر آتے ہیں، اسے قرآن میں زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے: 'یاایہا الذین آمنوا، استجیبوا للّٰہ وللرسول، اذا دعاکم لما یحییکم'[۱۴] (ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو، جب کہ رسول تمھیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے جس میں تمھارے لیے زندگی ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جینے کو تو سب جیتے ہیں، لیکن وہ حقیقی زندگی جسے نور، سکینت اور ایمان کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، صرف اللہ کی یاد سے ملتی ہے۔ انبیا علیہم السلام اسی کی دعوت دیتے ہیں اور اس میں سب سے پہلے نماز کے لیے بلاتے ہیں۔ نماز کیا ہے؟ خدا کی معرفت، اس کا ذکر و فکر اور اس کی قربت کا احساس جب اپنے منتہاے کمال کو پہنچتا ہے تو نماز بن جاتا ہے۔ دنیا کے سب عارفوں کا فیصلہ ہے کہ اصل زندگی دل کی زندگی ہے اور دل کی زندگی یہی معرفت، ذکر و فکر اور قربت الٰہی ہے۔ یہ زندگی انسان کو صرف نماز سے حاصل ہوتی ہے اور نماز ہی سے باقی رہتی ہے۔ قرآن نے ایک جگہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت کو رکھ کر یہی حقیقت واضح کی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (الانعام ۶: ۱۶۲)

''کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

انسان اس حقیقت کو پالے تو اپنے شب و روز میں وہ نماز کے لیے اسی طرح منتظر رہتا ہے، جس طرح صبح و شام کے

۱۴؎ الانفال ۸: ۲۴۔

کھانے اور پینے کا منتظر رہتا ہے اور اسی طرح بے تاب ہوتا ہے جس طرح پیاسا پانی کے لیے اور بھوکا روٹی کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ نماز اس کے لیے خداوند عالم کا رزق بن جاتی ہے۔ وہ اسی سے آسودہ ہوتا اور اسی سے قوت پاتا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے: انسان صرف روٹی ہی سے نہیں جیتا، بلکہ ہر ایک بات سے جو خدا کے منہ سے نکلتی ہے[15]۔ لوگ جس طرح انواع و اقسام کے کھانوں سے لذت کام و دہن کا سامان کرتے ہیں، وہ اسی طرح قرآن کے مختلف مقامات اور متنوع تسبیحات اور دعاؤں سے اپنی روح کے لیے لذت کا سامان کرتا ہے۔ مصائب کے حبس میں نماز ہی نسیم جاں فزا، گناہ کی آلایشوں میں نماز ہی ہوائے عطر بیز، مایوسیوں کی پت جھڑ میں نماز ہی نوید بہار اور مخالفتوں کے ہجوم میں نماز ہی اس کے لیے پناہ کی چٹان ہوتی ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھیے۔ نماز سے متعلق یہ اسی مقام کی کیفیات ہیں جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 'قم یا بلال، فأرحنا بالصلوٰة[16]' (بلال، اٹھو اور ہمیں نماز کے ذریعے سے راحت پہنچاؤ) اور 'جعلت قرة عینی فی الصلوٰة[17]' (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے) جیسے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

[باقی]

۱۵؎ متی ۴:۴۔

۱۶؎ ابوداؤد، رقم ۴۹۸۶۔

۱۷؎ النسائی، رقم ۳۹۴۰۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد عمار خان ناصر

مسجد اقصیٰ، یہود اور امت مسلمہ

عالم اسلام اس وقت اپنے طول وعرض میں جن سیاسی مسائل اور مشکلات سے دوچار ہے، ان میں مسئلہ فلسطین اس لحاظ سے ایک خاص مذہبی نوعیت بھی رکھتا ہے کہ یہ سرزمین بے شمار انبیا کا مولد ومسکن ہونے کی نسبت سے ایک نہایت بابرکت اور مقدس سرزمین سمجھی جاتی ہے اور اس میں انبیاے بنی اسرائیل کی یادگار کی حیثیت رکھنے والی تاریخی مسجد اقصیٰ موجود ہے جس کی تولیت کے حق کا مسئلہ مسلمانوں اور یہود کے مابین متنازع فیہ ہے۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ اس جگہ صدیوں پہلے ''ہیکل سلیمانی'' کے نام سے ان کا ایک انتہائی مقدس مرکز عبادت تعمیر ہوا تھا جو گوناگوں تاریخی حالات اور واقعات کے نتیجے میں تباہ وبرباد ہو گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب اس جگہ کو دوبارہ اپنے تصرف میں لے کر یہاں اس عبادت گاہ کو از سر تعمیر کریں۔ اگرچہ اسرائیلی حکومتیں اور وہاں کے سیکولر حلقے بالعموم اس تصور کی حوصلہ شکنی ہی کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور خود یہود کے مذہبی حلقوں میں بھی اس کی تفصیلات کے حوالے سے بہت کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں، تاہم اصولی طور پر اس جگہ کی بازیابی اور یہاں ہیکل کی تعمیر کو ان کے اعتقاد کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہے۔

اس کے مقابلے میں امت مسلمہ کی نمائندگی کرنے والے کم وبیش تمام مقتدر اہل علم اور علمی وسیاسی ادارے مسجد اقصیٰ کے حوالے سے جس موقف پر متفق ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ مقام تاریخی اور شرعی لحاظ سے بلا شرکت غیرے مسلمانوں کی ملکیت ہے، اس کی تولیت اور اس میں عبادت خالصتاً مسلمانوں کا استحقاق ہے، اور یہود کا اس مقام پر عبادت کرنے یا یہاں ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کا مطالبہ مسلمانوں کے ایک مقدس مقام کی توہین اور ان کے مذہبی جذبات کی پامالی کی ایک سازش ہے۔

ہمارا احساس یہ ہے کہ امت مسلمہ کی جانب سے اجتماعی طور پر اختیار کردہ اس رویے کی تشکیل میں بنیادی عنصر کی حیثیت مسئلے کی جذباتی نوعیت اور عرب اسرائیل سیاسی کشاکش کو حاصل ہے اور بعض نہایت اہم شرعی، اخلاقی اور تاریخی پہلوؤں کے

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

نظرانداز ہو جانے کی وجہ سے اس معاملے میں توازن واعتدال کی حدود ٹھیک ٹھیک ملحوظ نہیں رکھی جا سکیں۔ چنانچہ صورت حال اس بات کا مقتضی ہے کہ تعصّبات وجذبات سے بالاتر ہو کر قرآن وسنت کی روشنی میں بے لاگ طریقے سے اس مسئلے کا جائزہ لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے نہایت اہتمام کے ساتھ اس امت پر یہ واضح کیا ہے کہ ان کے ہاتھ سے عدل وانصاف کا دامن کسی حال میں بھی نہیں چھوٹنا چاہیے، چاہے معاملہ کسی ایسے گروہ ہی کا کیوں نہ ہو جس نے ان پر ظلم وزیادتی کی اور ان کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کیا ہو:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا یَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ. (المائدہ ۵:۸)

''اے ایمان والو، اللہ کی خاطر عدل وانصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ، اور ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کے ساتھ دشمنی تمھیں برانگیختہ کر کے ناانصافی پر آمادہ کر دے۔ عدل پر قائم رہو، یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمھارے اعمال کی پوری پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

اگر مسلمان کسی موقع پر عدل وانصاف کے طریقے سے گریز کا رویہ اختیار کریں تو قرآن مجید کی رو سے اہل ایمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی رورعایت کے بغیر اپنے بھائیوں کے سامنے حق بات کی شہادت دیں، چاہے اس کی زد خود مسلمانوں کے جذبات یا ان کے ظاہری مفادات پر ہی پڑتی ہو:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ اِنۡ یَّكُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا. (النساء ۴:۱۳۵)

''اے ایمان والو، عدل وانصاف پر پوری طرح قائم ہو کر اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ، چاہے اس کی زد خود تمھارے اپنے یا تمھارے والدین اور اقربا کے مفادات پر پڑے۔ وہ شخص غنی ہو یا فقیر، دونوں صورتوں میں اللہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ تم خواہش کی پیروی میں انصاف کے طریقے سے ہٹ نہ جاؤ۔ اور اگر تم گواہی میں کج بیانی کرو گے یا گواہی دینے سے اعراض کا طریقہ اختیار کرو گے تو یاد رکھو اللہ تمھارے اعمال کی پوری پوری خبر رکھنے والا ہے۔''

ذیل کی سطور میں ہم نے اسی جذبے کے ساتھ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مسجد اقصیٰ کی مختصر تاریخ

مصریوں کی غلامی سے رہائی کے بعد جب صحراے سینا میں بنی اسرائیل کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے باقاعدہ شریعت عطا کی گئی تو ساتھ ہی حضرت موسیٰ کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ وہ بدنی اور مالی عبادت کی مختلف رسوم ادا کرنے کے لیے خیمے کی شکل میں بنی اسرائیل کے لیے ایک عبادت گاہ بنائیں۔ اس خیمے کی بناوٹ، اس کے ساز وسامان اور اس میں ادا کی جانے والی رسوم کی پوری تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو سمجھائی۔[1] تورات میں اس خیمے کا ذکر ''خیمۂ اجتماع''، ''مقدس''، ''مسکن'' اور ''شہادت کا خیمہ'' کے مختلف ناموں سے کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ خاص وضع کا ایک صندوق بنا کر اس میں تورات کی الواح کو محفوظ کریں اور اسے 'خیمہ اجتماع' میں ایک مخصوص مقام پر مستقل طور پر رکھ دیں۔[2] تورات میں اس کو 'عہد کا صندوق' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اس متحرک اور قابل انتقال (Mobile) عبادت گاہ کا حکم صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے عارضی قیام اور مسلسل نقل مکانی کے پیش نظر دیا گیا تھا۔ ۱۴۵۰ ق م میں حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بیت المقدس کو فتح کیا۔ اس کے بعد تقریباً چار صدیوں تک بنی اسرائیل علاقے میں پہلے سے آباد مختلف نسلی گروہوں کے ساتھ لڑنے اور انھیں مغلوب کرنے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ اس عرصے میں چونکہ سرزمین فلسطین پر بنی اسرائیل کے قبضے اور ان کے سیاسی اقتدار کو استحکام حاصل نہیں تھا، اس لیے مرکز عبادت کی حیثیت اسی 'خیمہ اجتماع' کو حاصل رہی۔ چار صدیوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد آخر سیدنا داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل ان کی قیادت میں ان مقامی گروہوں کو بڑی حد تک کچلنے اور ایک مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھنے میں کام یاب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک باقاعدہ مرکز عبادت تعمیر کرنے کی ہدایت ملی۔[3] حضرت داؤد نے اس مقصد کے لیے ارنان یبوسی نامی شخص سے اس کا ایک کھلیان خریدا جو کوہ موریا پر واقع تھا[4] اور تعمیر کے لیے ابتدائی تیاریاں شروع کر دیں۔[5] تاہم اپنی حیات میں وہ اس مرکز عبادت کو تعمیر نہ کر سکے اور اپنے فرزند سیدنا سلیمان علیہ السلام کو اس کی تعمیر کی وصیت کرتے ہوئے معبد کا تفصیلی نقشہ انھیں سمجھا کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔[6]

۱؎ خروج باب ۲۵ تا ۳۱۔

۲؎ خروج ۴۰: ۲۰۔

۳؎ ۲۔ سموئیل ۵ تا ۷۔

۴؎ تواریخ ۱: ۲۱: ۲۵۔

۵؎ تواریخ ۲: ۳: ۱۔

حضرت سلیمان نے اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے دورِ حکومت میں اس نقشے کے مطابق متعینہ جگہ پر ایک شان دار عبادت گاہ تعمیر کروائی جو تاریخ میں ''ہیکل سلیمانی'' (Solomon's Temple) کے نام سے معروف ہے۔ اس کی تعمیر ۹۵۰ ق م میں مکمل ہوئی۔ اپنی شان وشوکت اور جاہ وشکوہ کے لحاظ سے یہ عمارت عجائبات عالم میں شمار ہوتی تھی۔ اس کی تعمیر کی پوری تفصیل سلاطین ۱: ۶۔۸ اور تواریخ ۲: ۳۔۵ میں مذکور ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق اس کی بڑی بڑی محرابوں کی تعمیر کے لیے سلیمان علیہ السلام نے ان جنات سے بھی مدد لی تھی جنھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مسخر کر دیا تھا۔[7]

'خیمہ اجتماع' کی جگہ اب 'ہیکل سلیمانی' کو بنی اسرائیل کی عبادات اور مذہبی رسوم کے لیے قبلہ اور ان کی مذہبی واجتماعی زندگی کے محور ومرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سوختنی قربانیوں کے لیے مذبح[8] اور عہد کے صندوق کے لیے ایک خاص کمرہ اسی معبد میں تعمیر کیا گیا۔[9] اس کی تکمیل کے موقع پر سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور جو دعا کی، اس سے واضح ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے اس عبادت گاہ کو اسی طرح ایک روحانی مرجع ومرکز اور 'مثابة للناس' کی حیثیت دے دی گئی تھی جس طرح بنی اسمٰعیل کے لیے مسجد حرام کو:

''اور سلیمان نے اسرائیل کی ساری جماعت کے روبرو خداوند کے مذبح کے آگے کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اور کہا... اے خداوند میرے خدا اپنے بندہ کی دعا اور مناجات کا لحاظ کر کے اس فریاد اور دعا کو سن لے جو تیرا بندہ آج

---

۶ تواریخ ۱: ۲۲، ۲۸: ۱۱۔۲۱۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوذر سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ روئے زمین پر سب سے پہلے کون سی مسجد تعمیر کی گئی؟ آپ نے فرمایا: مسجد حرام۔ انھوں نے سوال کیا کہ اس کے بعد؟ آپ نے فرمایا: مسجد اقصیٰ۔ انھوں نے دوبارہ سوال کیا کہ ان دونوں کی تعمیر کے مابین کتنا عرصہ تھا؟ آپ نے فرمایا: چالیس سال۔ (صحیح البخاری، رقم ۳۴۲۵)

اس روایت پر یہ اشکال ہے کہ تاریخ کے مسلمات کی رو سے مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی اور ان کے اور سیدنا ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کے مابین، جو مسجد حرام کے معمار تھے، کئی صدیوں کا فاصلہ ہے جبکہ روایت میں دونوں مسجدوں کی تعمیر کے درمیان صرف چالیس سال کا فاصلہ بتایا گیا ہے۔

علماے حدیث کے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ مسجد اقصیٰ کے مقام کی تعیین تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرما دی تھی اور مذکورہ روایت میں اسی کا ذکر ہے، جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے صدیوں بعد اسی جگہ پر ہیکل سلیمانی کو تعمیر کیا۔ اس لحاظ سے ان کی حیثیت ہیکل کے اولین بانی اور موسس کی نہیں بلکہ تجدید کنندہ کی ہے۔ (ابن قیم: زاد المعاد، ۱/ ۵۰۔ ابن حجر: فتح الباری، ۶/ ۴۹۵۔ ابن کثیر: قصص الانبیاء، ۱۵۵)

۷ سبا: ۱۳۔

۸ تواریخ ۱: ۲۲: ۱۔

۹ تواریخ ۱: ۲۲: ۱۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے دن تیرے حضور کرتا ہے تاکہ تیری آنکھیں اس گھر کی طرف یعنی اسی جگہ کی طرف جس کی بابت تو نے فرمایا کہ میں اپنا نام وہاں رکھوں گا، دن اور رات کھلی رہیں تاکہ تو اس دعا کو سنے جو تیرا بندہ اس مقام کی طرف رخ کر کے تجھ سے کرے گا۔ اور تو اپنے بندہ اور اپنی قوم اسرائیل کی مناجات کو جب وہ اس جگہ کی طرف رخ کر کے کریں، سن لینا بلکہ تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے، سن لینا اور سن کر معاف کر دینا۔ اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کا گناہ کرے اور اسے قسم کھلانے کے لیے اس کو حلف دیا جائے اور وہ آ کر اس گھر میں تیرے مذبح کے آگے قسم کھائے تو تو آسمان پر سے سن کر عمل کرنا اور اپنے بندوں کا انصاف کرنا۔..... جب تیری قوم اسرائیل تیرا گناہ کرنے کے باعث اپنے دشمنوں سے شکست کھائے اور پھر تیری طرف رجوع لائے اور تیرے نام کا اقرار کر کے اس گھر میں تجھ سے دعا اور مناجات کرے تو تو آسمان پر سے سن کر اپنی قوم اسرائیل کا گناہ معاف کرنا اور ان کو اس ملک میں جو تو نے ان کے باپ دادا کو دیا، پھر لے آنا۔ جب اس سبب سے کہ انھوں نے تیرا گناہ کیا ہو، آسمان بند ہو جائے اور بارش نہ ہو اور وہ اس مقام کی طرف رخ کر کے دعا کریں اور تیرے نام کا اقرار کریں اور اپنے گناہ سے باز آئیں جب تو ان کو دکھ دے تو تو آسمان پر سے سن کر اپنے بندوں اور اپنی قوم اسرائیل کا گناہ معاف کر دینا... اگر ملک میں کال ہو، اگر وبا ہو، اگر بادسموم یا گیروئی یا ٹڈی یا کملا ہو، اگر ان کے دشمن ان کے شہروں کے ملک میں ان کو گھیر لیں، غرض کیسی ہی بلا کیسا ہی روگ ہو تو جو دعا اور مناجات کسی ایک شخص یا تیری قوم اسرائیل کی طرف سے ہو جن میں سے ہر شخص اپنے دل کا دکھ جان کر اپنے ہاتھ اس گھر کی طرف پھیلائے تو تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے، سن کر معاف کر دینا... اب رہا وہ پردیسی جو تیری قوم اسرائیل میں سے نہیں ہے، وہ جب دور ملک سے تیرے نام کی خاطر آئے ... اور اس گھر کی طرف رخ کر کے دعا کرے تو تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے، سن لینا..... اگر تیرے لوگ خواہ کسی راستہ سے تو ان کو بھیجے، اپنے دشمن سے لڑنے کو نکلیں اور وہ خداوند سے اس شہر کی طرف جسے تو نے چنا ہے اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا ہے، رخ کر کے دعا کریں تو تو آسمان پر سے ان کی دعا اور مناجات سن کر ان کی حمایت کرنا۔ اگر وہ تیرا گناہ کریں (کیونکہ کوئی ایسا آدمی نہیں جو گناہ نہ کرتا ہو) اور تو ان سے ناراض ہو کر ان کو دشمن کے حوالہ کر دے ایسا کہ وہ دشمن ان کو اسیر کر کے اپنے ملک میں لے جائے خوہ وہ دور ہو یا نزدیک تو بھی اگر وہ اس ملک میں جہاں وہ اسیر ہو کر پہنچائے گئے، ہوش میں آئیں اور رجوع لائیں..... اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا ہے، رخ کر کے تجھ سے دعا کریں تو تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے، ان کی دعا اور مناجات سن کر ان کی حمایت کرنا..... سو تیری آنکھیں تیرے بندہ کی مناجات اور تیری قوم اسرائیل کی مناجات کی طرف کھلی رہیں تاکہ جب کبھی وہ تجھ سے فریاد کریں تو ان کی سنے۔[10]''

---

[10] ۱- سلاطین ۸: ۲۲-۵۳۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حضرت سلیمان علیہ السلام جب بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو انھوں نے دعا کی کہ جو شخص بھی مسجد اقصیٰ میں خالصتاً نماز پڑھنے کے ارادے سے آئے، وہ یہاں سے اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر جائے جیسے بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھے امید ہے کہ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول فرما لی ہو گی۔''

(نسائی، رقم ۶۹۴۔ ابن ماجہ، ۱۴۰۸)

اس طرح اس عبادت گاہ کو بنی اسرائیل کے ایک مذہبی و روحانی مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی عظمت و شوکت اور دنیاوی جاہ و جلال کے ایک نشان کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی زبانی بنی اسرائیل کو یہ تنبیہ بھی اس عبادت گاہ کی تعمیر کے ساتھ ہی فرما دی تھی کہ:

''اگر تم میری پیروی سے برگشتہ ہو جاؤ اور میرے احکام اور آئین کو جو میں نے تمہارے آگے رکھے ہیں، نہ مانو بلکہ جا کر اور معبودوں کی عبادت کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگو تو میں اسرائیل کو اس ملک سے جو میں نے ان کو دیا ہے، کاٹ ڈالوں گا اور اس گھر کو جسے میں نے اپنے نام کے لیے مقدس کیا ہے، اپنی نظر سے دور کر دوں گا اور اسرائیل سب قوموں میں ضرب المثل اور انگشت نما ہوگا اور اگرچہ یہ گھر ایسا ممتاز ہے تو بھی ہر ایک جو اس کے پاس سے گزرے گا، حیران ہوگا اور سسکا رہے گا اور وہ کہیں گے کہ خداوند نے اس ملک اور اس گھر سے ایسا کیوں کیا؟'' (۱۔سلاطین ۹: ۱۔۹ نیز دیکھیے ۲۔تواریخ ۷: ۱۱۔۲۲)

ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے ۳۵۰ سال بعد یہ پیش گوئی پہلی مرتبہ یرمیاہ نبی کے زمانے میں پوری ہوئی۔ بنی اسرائیل کے اجتماعی طور پر شرک میں مبتلا ہو جانے اور شریعت کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دینے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے بابل کے بادشاہ نبوکدنضر کو ان پر مسلط کیا جس نے ۵۸۶ ق م میں یروشلم پر حملہ کر کے ہیکل کو جلا کر برباد کر دیا، اس کے تمام خزانے اور قیمتی ظروف لوٹ لیے، بنی اسرائیل کا قتل عام کیا اور انھیں اسیر بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔[۱۱]

بنی اسرائیل کی توبہ اور اصلاح حال کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ آزادی کی نعمت عطا کی اور فارس کے بادشاہ خورس (Cyrus) نے بابل کو فتح کرنے کے بعد ۵۳۸ ق م میں اسیری میں آئے ہوئے بنی اسرائیل کو واپس یروشلم جانے اور وہاں ہیکل کو دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔[۱۲]

ہیکل ثانی کی تعمیر، جس کو زربابلی ہیکل کا نام دیا گیا، ۵۱۵ ق م میں مکمل ہوئی۔ یہ ایک بالکل سادہ سی عبادت گاہ تھی جس کا اور تزئین و آرائش اور تعمیر کے معیار کے لحاظ سے سلیمانی ہیکل کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں تھا۔ (حجی ۲: ۳۔۹) یہ عبادت گاہ تقریباً ۴۵۰ سال تک قائم رہی لیکن اس عرصے میں وقتاً فوقتاً حملہ آوروں کے ہاتھوں بے حرمتی کا نشانہ بنتی رہی۔ ۱۶۹ ق م میں یونانی بادشاہ انطوخیوس چہارم اپی فینس نے ہیکل پر قبضہ کر کے اس کے ساز و سامان اور خزانے کو لوٹ لیا[۱۳] اور اس میں زیوس (Zeus) دیوتا کے نام پر قربانی کا مذبح قائم کر کے سردار کاہن کو مجبور کیا کہ وہ اس پر ایک خنزیر کو قربانی کرے۔ اس کے ردعمل میں 'مکابیوں کی بغاوت' نے جنم لیا اور ۱۶۵ ق م میں یہوداہ مکابی کی قیادت میں بنی اسرائیل حملہ آوروں کو بے دخل کر کے ہیکل کی بازیابی اور تطہیر میں کام یاب ہو گئے۔[۱۴] اس کی یاد میں یہودی اب تک حنوکہ (Hanukkah) کا سالانہ تہوار مناتے ہیں۔

---

[۱۱] تواریخ ۲: ۳۶: ۱۱۔۲۱، یرمیاہ ۵۲: ۱۲۔۱۴۔

[۱۲] عزرا ۱: ۱۔

[۱۳] مکابیوں ۱: ۱: ۲۰۔۲۴۔

۶۳ ق م میں یونانیوں کی جگہ جنرل پومپی کی قیادت میں رومی فوج نے فلسطین پر قبضہ کیا تو اس موقع پر زربابلی ہیکل کا ایک بڑا حصہ تباہی کی نذر ہو گیا۔ بعد میں رومی حکومت نے یہودیوں کو نیم سیاسی خود مختاری دے دی تو یہودیہ کے بادشاہ عظیم ہیرودیس نے، جس کا زمانہ حکومت ۳۷ ق م سے ۴ عیسوی تک ہے، زربابلی ہیکل کی تعمیر نو کر کے ہیکل کے رقبے کو وسیع تر کر دیا، اس کے گرد چار دیواری تعمیر کی اور زمین سے اس کی اونچائی مزید بلند کر دی۔ یہ تعمیر ۱۹ ق م میں شروع ہو کر ۴۶ سال تک جاری رہی۔

ہیکل کی تباہی اور فلسطین سے یہودیوں کی بے دخلی کی پیش گوئی دوسری مرتبہ ۷۰ء میں پوری ہوئی۔ ۶۶ء میں یہودیوں نے رومی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی جس کو کچلنے کے لیے رومی جنرل طیطس (Titus) نے ۷۰ء میں یروشلم پر حملہ کر کے یہود کا قتل عام کیا اور ہیکل کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا گیا اور یروشلم میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا، تاہم بعد کے ادوار میں یہ پابندی نرم کر کے یہودیوں کو مخصوص مواقع پر یروشلم میں آنے اور ہیکل کے کھنڈرات کی زیارت کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ہیکل کی اس دوسری تباہی میں اس کی صرف مغربی دیوار محفوظ رہ گئی تھی جو رفتہ رفتہ یہودیوں کا مقام اجتماع اور ان کی گریہ وزاری کا مرکز بن گئی اور اس بنا پر ''دیوار گریہ'' (Wailing Wall) کہلانے لگی۔[15]

۱۳۶ء میں رومی شہنشاہ ہیڈرین نے یروشلم کو دوبارہ آباد کر کے اس کا نام Aelia Capitolina رکھا اور ہیکل کی جگہ رومی دیوتا Jupiter کے نام پر ایک عالی شان معبد تعمیر کرایا۔ چوتھی صدی عیسوی میں مسیحیت کے روم کا سرکاری مذہب بن جانے کے بعد ۳۳۶ء میں قسطنطین اعظم نے اس معبد کی جگہ کلیسائے نشور (Church or Resurrection) تعمیر کرا دیا۔

۶۳۸ء میں مسلمانوں نے یروشلم کو فتح کیا تو اس موقع پر امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ صحابہ کی معیت میں مسجد

---

[14] مکابیوں ۱: ۴: ۳۶۔ ۴۸۔

[15] ہیکل سلیمانی کی ان دو مشہور و معروف بربادیوں کا تذکرہ قرآن مجید نے بھی سورۂ بنی اسرائیل میں کیا ہے:

''اور ہم نے تورات میں بنی اسرائیل سے صاف کہہ دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی پر اتر آؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلا موقع آیا تو ہم نے تم پر اپنے نہایت سخت گیر اور طاقت ور بندوں کو مسلط کر دیا جو تمہارے گھروں کے اندر گھس آئے، اور یہ وعدہ پورا ہو کر رہنا تھا۔ پھر ہم نے ان کے خلاف تمہیں بالا دستی کا موقع دیا اور مال و اولاد سے تمہاری مدد کی اور تمہیں خوب جتھے والا بنا دیا۔ اگر تم نے بھلائی کا رویہ اختیار کیا تو اپنے ہی فائدے کے لیے، اور اگر بدچلن ہو گئے تو اپنا ہی نقصان کیا۔ پھر جب دوسرا موقع آیا (تو اسی طرح دشمنوں کو تم پر مسلط کیا جو تم پر چڑھ آئے) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑ کر رکھ دیں اور اسی طرح مسجد میں گھس جائیں جس طرح پہلی مرتبہ گھسے تھے اور جو چیز ان کے ہاتھ لگے، اس کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ توقع ہے کہ تمہارا رب تم پر پھر رحم کرے گا۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ یہی رویہ اپنایا تو ہم بھی یہی کچھ کریں گے۔ اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔'' (بنی اسرائیل)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اقصیٰ میں آئے۔ اس وقت ہیکل کے پتھر (صخرۂ بیت المقدس) کے اوپر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا۔ سیدنا عمر نے صحابہ کے ساتھ مل کر اس کو صاف کیا اور احاطۂ ہیکل کی جنوبی جانب میں نماز پڑھنے کے لیے ایک جگہ مخصوص کر دی۔ بعد میں اس جگہ پر لکڑی کی ایک مسجد تعمیر کی گئی۔ ۶۸۸ء میں اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان نے صخرۂ بیت المقدس کے اوپر ایک شان دار گنبد تعمیر کرا دیا جو 'قبۃ الصخرۃ' (Dome of Rock) کے نام سے معروف ہے۔ اسی نے لکڑی کی مذکورہ سادہ مسجد کی تعمیر نو کر کے اس کے رقبے کو مزید وسیع کر دیا۔ اسلامی لٹریچر میں 'مسجد اقصیٰ' سے مراد یہی مسجد ہے۔

۱۰۷۸ء میں جب سلجوقی ترکوں نے یروشلم پر قبضہ کیا تو ان کے ۲۰ سالہ دور حکومت میں یورپ اور پوری دنیا سے آنے والے مسیحی زائرین کے ساتھ ناروا سلوک اختیار کیا گیا اور ان کی زیارت میں رکاوٹ ڈالی گئی۔ اس کے ردعمل میں ۱۰۹۶ء میں مغربی یورپ میں غیض وغضب کی ایک لہر اٹھی جس نے صلیبی جنگوں کا روپ دھار لیا۔ پوپ اربن دوم کے حکم پر عیسائی مجاہدین کا ایک لشکر یروشلم پر قبضے کے لیے روانہ ہوا جس نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم پر قبضہ کر کے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرۃ کو اپنے تصرف میں لے لیا۔ مسیحی فاتحین نے قبۃ الصخرہ کے اوپر ایک صلیب نصب کر کے اس کو Templum Domini کا اور مسجد اقصیٰ کو Templum Solomonis کا نام دے دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۸۸ سال کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۱۸۷ء کو مسلمان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں دوبارہ یروشلم پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور مسجد اقصیٰ کو مسجد کی حیثیت سے بحال کر کے قبۃ الصخرہ سے صلیب اتار دی گئی۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل مشرقی یروشلم پر قبضہ کرنے میں کام یاب ہو گیا جس میں مسجد اقصیٰ واقع ہے اور مسجد کو اسرائیلی فوج نے اپنے کنٹرول میں لے لیا، تاہم اسرائیلی وزیر دفاع موشے دایان نے خیر سگالی کے اظہار کے طور پر احاطۂ مقدسہ کی چابیاں اردن کے حکمران ہاشمی خاندان کے سپرد کر دیں۔ اس وقت سے اس احاطے اور اس سے ملحق بعض عمارتوں کا کنٹرول یروشلم کے مسلم وقف کے پاس ہے جو اس کے جملہ امور کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہے۔[۱۶]

اس مختصر جائزے سے واضح ہے کہ تاریخی لحاظ سے مسجد اقصیٰ کے ساتھ مذہبی تعلق و وابستگی کے دعوے دونوں فریق بنیادی طور پر سچے ہیں۔ یہودیوں کے لیے یہ عبادت گاہ قبلہ و مرکز اور ان کی دینی و دنیاوی عظمت رفتہ کے نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دعا اور مناجات کے لیے وہ اسی کی طرف رخ کرتے ہیں اور اس میں سلسلۂ عبادت کے احیا کی تمنائیں بر آنے کے لیے صدیوں سے ان کے سینوں میں تڑپ رہی ہیں۔

مسلمانوں کی وابستگی اور عقیدت بھی اس عبادت گاہ کے ساتھ معمولی نہیں۔ یہ مقام انبیاے بنی اسرائیل کی ایک

۱۶؎ مسجد اقصیٰ کی تاریخ سے متعلق ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: ممتاز لیاقت: ''تاریخ بیت المقدس''، منشی عبد القدیر: ''بیت المقدس''، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، مقالہ جات: Solomon's Temple, Wailing Wall۔

یادگار ہے جن پر ایمان اور جن کا احترام و تعظیم مسلمانوں کے اعتقاد کا جز ولاینفک ہے۔ انہوں نے اس وقت اس عبادت گاہ کو آباد کیا جب یہود و نصاریٰ کی باہمی آویزشوں کے نتیجے میں یہ ویران پڑی تھی۔ ان کا یہ عمل تمام مذہبی، عقلی اور اخلاقی معیارات کے مطابق ایک نہایت اعلیٰ روحانی اور مبارک عمل ہے جس پر وہ جتنا بھی فخر کریں، کم ہے۔

فریقین کے تعلق و وابستگی کے دعوے کو درست مان لینے کے بعد اب سوال یہ ہے کہ اس پر تولیت کا حق کس فریق کو ملنا چاہیے اور فریقین میں سے کس کے حق کو کس بنیاد پر ترجیح دی جائے؟ جہاں تک قانونی پہلو کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے دعوائے تولیت کو ایک عملی وجہ ترجیح حاصل ہے۔ مسلمان بحالت موجودہ اس کی تولیت کے ذمہ دار ہیں اور یہ ذمہ داری وہ گزشتہ تیرہ صدیوں سے، صلیبی دور کے استثنا کے ساتھ، تسلسل کے ساتھ انجام دیتے چلے آ رہے ہیں۔ انہوں نے یہ عبادت گاہ نہ یہودیوں سے چھینی تھی اور نہ ان کی پہلے سے موجود کسی عبادت گاہ کو ڈھا کر اس پر اپنی عبادت گاہ تعمیر کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کی متعدد قرار دادوں میں بھی اس کی تولیت کا حق دار مسلمانوں ہی کو تسلیم کیا گیا ہے۔

تاہم قانونی پہلو کو اس معاملے کا واحد قابل لحاظ پہلو سمجھنے کے عام نقطہ نظر سے ہمیں اختلاف ہے اور زیر نظر تحریر میں ہم اسی نکتے کی توضیح کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ اس نوعیت کے مذہبی تنازعات میں قرآن سنت کی رو سے اصل قابل لحاظ چیز، جس کی رعایت مسلمانوں کو لازماً کرنی چاہیے، وہ اخلاقی پہلو ہے۔ اس بحث کی تنقیح کے لیے ہمارے نزدیک اس بنیادی سوال پر غور وخوض مناسب ہوگا کہ مسجد اقصیٰ کی تولیت کا مسلمانوں کے ہاتھوں میں آنا آیا شرعی نوعیت کا کوئی معاملہ ہے یا تکوینی و واقعاتی نوعیت کا؟ دوسرے لفظوں میں، آیا یہ اسلامی شریعت کا کوئی حکم اور تقاضا ہے کہ مسلمان یہود کو اس عبادت گاہ سے لاتعلق قرار دے کر ان کی جگہ اس کی تولیت کی ذمہ داری خود سنبھال لیں یا محض تاریخی حالات و واقعات نے ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مسلمانوں کو اس کی تولیت کی ذمہ داری اٹھانی پڑی؟

اگر معاملہ شرعی نوعیت کا ہے تو پھر اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ وہ نصوص اور دلائل جن سے اس ضمن میں استناد کیا جا سکتا ہے، کون سے ہیں اور عقل و منطق کی میزان میں ان سے استدلال کتنا وزن رکھتا ہے؟

اور اگر معاملے کی نوعیت شرعی نہیں بلکہ واقعاتی ہے تو پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اس سلسلے میں عام مذہبی اخلاقیات اور خود اسلامی تعلیمات کا تقاضا کیا ہے اور کیا محض واقعاتی تسلسل اخلاقی لحاظ سے اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ یہود کے تاریخی و مذہبی حق کو بالکل مسترد کر دیا جائے؟

آیئے ان دونوں نکتوں کا ذرا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔

حق تولیت سے یہود کی معزولی

سب سے پہلے ہم اس امکان پر غور کریں گے کہ مسلمانوں کو مسجد اقصیٰ کی تولیت کا حق حالات و واقعات کے نتیجے میں

نہیں، بلکہ شریعت کے کسی با قاعدہ حکم کے تحت ملا ہے۔ اس سلسلے میں بنیادی استدلال یہ ہے کہ چونکہ یہود انبیا کے قتل، عہد شکنی، تحریف آیات اور کتمان حق کے مجرم ہیں اور اس جرم کی پاداش میں انھیں دنیا کی رہنمائی اور فضیلت علی العالمین کے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے، اس لیے انبیاء کی سرزمین اور ان کی قائم کردہ عبادت گاہ پر بھی ان کا کوئی حق باقی نہیں رہا اور جس طرح انبیا کے مشن کی وراثت امت مسلمہ کو منتقل ہو گئی ہے، اسی طرح مسجد اقصیٰ کی ملکیت وتولیت کا حق بھی یہود سے چھن کر ان کو منتقل ہو گیا ہے۔ مکتب دیوبند کے معروف عالم دین مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اس استدلال کو یوں واضح کیا ہے:

''یہ تینوں مرکز اسلام کی جامعیت کی وجہ سے مسلمانوں کو کسی کے دیے سے نہیں ملے بلکہ خدا کی طرف سے عطا ہوئے اور انھی کے قبضہ وتصرف میں دیے گئے ہیں جن میں کسی غیر کے دخل یا قبضہ کا از روئے اصول کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔...... حجاز میں مشرکین ملت ابراہیم کے نام سے عرب پر قابض ومتصرف تھے لیکن جب انھوں نے شعائر اللہ کی جگہ بے جان مورتیوں اور پتھر کے سنگ دل خداؤں کو جگہ دے دی.... تو سنت اللہ کے مطابق قبضہ تبدیل کر دیا گیا۔....شام کی مقدس سرزمین بلاشبہ اولاً یہود کو دی گئی اور فلسطین ان کے حصہ میں لگا دیا گیا جیسا کہ قرآن نے 'کتب اللّٰہ لکم' سے اس کا انھیں دے دیا جانا ظاہر کیا ہے لیکن انھوں نے عہد شکنی کی اور خدائی تعلیمات سے منہ موڑ کر الٰہی میثاق کو توڑ ڈالا۔...ان حرکات کے انتہا کو پہنچ جانے پر حق تعالیٰ نے انھیں بیت المقدس کی تولیت اور اس ملک کی ملکیت سے محروم کر کے ان پر نصاریٰ کو مسلط کیا چنانچہ بعثت نبوی سے تین سو سال پہلے نصاریٰ شام اور فلسطین کی ارض مقدس پر قابض ہو گئے۔..... لیکن اقتدار جم جانے کے بعد ردعمل شروع ہوا اور بالآخر وہ بھی قومی اور طبقاتی رقابتوں میں مبتلا ہو کر اسی راہ چل پڑے جس پر یہود چلے تھے۔...صخرہ معلقہ کو جو یہود کا قبلہ تھا، غلاظت کی جگہ قرار دیا اور اس کی انتہائی توہین شروع کر دی۔ محض اس لیے کہ وہ یہود کا قبلہ تھا، اس پر پلیدی ڈالی اور اسے مزبلہ (کوڑی) بنا کر چھوڑا۔...ظاہر ہے کہ شعائر الٰہیہ اور نشانات خداوندی کی توہین کے بعد کوئی قوم بھی پنپ نہیں سکتی اس لیے بالآخر نصاریٰ کا بھی وقت آ گیا۔ ان کا اقتدار یہاں ختم ہوا اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ دے کر انھیں بیت المقدس کا متولی بنایا۔'' (مقامات مقدسہ اور اسلام کا اجتماعی نظام، ص ۶۴۳ تا ۶۴۷)

اس استدلال کے حاصل کو اگر فقہی اصطلاح میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ اس میں اہل کتاب کو 'مشرکین مکہ' پر اور اس کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ کی تولیت کے معاملے کو مسجد حرام کی تولیت کے معاملے پر 'قیاس' کیا گیا ہے۔

ہماری رائے میں یہ استدلال دو وجوہ سے اپنی بنیاد ہی کے لحاظ سے غلط ہے:

ایک یہ کہ اس میں ایک ایسے امر میں قیاس کو دخل دیا گیا ہے جو درحقیقت 'نص' کا متقاضی ہے۔ کسی مذہب کے ماننے والوں کو ان کی کسی عبادت گاہ بلکہ قبلہ اور مرکز عبادات کے حق تولیت سے محروم کرنا ایک ایسا نازک معاملہ ہے کہ اس میں کسی واضح نص کے بغیر محض قیاس کی بنیاد پر کوئی اقدام کیا ہی نہیں جا سکتا۔ چنانچہ دیکھیے، مسجد حرام پر مشرکین کی تولیت کی اخلاقی حیثیت پر قرآن مجید میں یہ تبصرہ ۲ ہجری میں غزوۂ بدر سے متعلق احکام وہدایات کے ضمن میں نازل ہو چکا تھا:

وَمَالَهُمُ اَلَّا یُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمُ یَصُدُّوُنَ عَنِ الُمَسُجِدِ الُحَرَامِ وَمَا کَانُوٓا اَوُلِیَآءَ هٗ اِنُ اَوُلِیَآؤُهٗٓ اِلَّا الُمُتَّقُوُنَ وَلٰکِنَّ اَکُثَرَ هُمُ لَا یَعُلَمُوُنَ. (الانفال ۸: ۳۴)

''اور ان میں کیا بات ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے، حالانکہ وہ مسجد حرام میں آنے سے لوگوں کو روکتے ہیں، جبکہ وہ اس پر تولیت کا حق بھی نہیں رکھتے۔ اس کی تولیت کا حق تو صرف پرہیز گاروں کا ہے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''

لیکن بیت اللہ پر مشرکین کی تولیت کے حق کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً اس وقت تک چیلنج نہیں کیا جب تک ۹ ہجری میں قرآن مجید میں اس کے بارے میں واضح ہدایت نازل نہیں ہوگئی حتیٰ کہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد بھی، جب مشرکین کی سیاسی قوت وشوکت بالکل ٹوٹ چکی تھی اور بیت اللہ کا حق تولیت ان سے چھین لینے میں کوئی ظاہری مانع موجود نہیں تھا، آپ نے کعبہ کی تولیت کے سابقہ انتظام ہی کو برقرار رکھا اور اس سال مسلمانوں نے اسی انتظام کے تحت ارکان حج انجام دیے۔[۱۷] مشرکین کو بھی اس سال حج بیت اللہ سے نہیں روکا گیا۔[۱۸]

۹ ہجری میں جب سورہ براءۃ میں مشرکین پر اتمام حجت اور ان سے اللہ اور اس کے رسول کی براءت کا اعلان کیا گیا تو اس کے ساتھ قرآن مجید میں باقاعدہ یہ حکم نازل ہوا کہ اب بیت اللہ پر مشرکین کسی قسم کا کوئی حق نہیں رکھتے لہٰذا آج کے بعد ان کو مسجد حرام کے قریب نہ آنے دیا جائے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مَاکَانَ لِلُمُشُرِکِیُنَ اَنُ یَّعُمُرُوُا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِیُنَ عَلٰٓی اَنُفُسِهِمُ بِالُکُفُرِ ط اُولٰٓئِکَ حَبِطَتُ اَعُمَالُهُمُ وَفِی النَّارِ هُمُ خٰلِدُوُنَ. اِنَّمَا یَعُمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنُ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالُیَوُمِ الُاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ وَلَمُ یَخُشَ اِلَّااللّٰهَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنُ یَّکُوُنُوُا مِنَ الُمُهُتَدِیُنَ. (براءت ۹: ۱۷۔۱۸)

''مشرکوں کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے کفر کی شہادت خود دیتے ہوئے وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں۔ ان کے اعمال اکارت ہیں اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مساجد کو آباد کرنے کا حق تو صرف ان کو ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ انہی لوگوں کے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے۔''

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیُنَ اٰمَنُوٓا اِنَّمَا الُمُشُرِکُوُنَ نَجَسٌ فَلَا یَقُرَبُوا الُمَسُجِدَ الُحَرَامَ بَعُدَ عَامِهِمُ هٰذَا. (براءت ۹: ۲۸)

''ایمان والو، بے شک مشرک ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔''

۱۷؎ شبلی نعمانی: سیرت النبی، ۱/ ۳۳۸۔

۱۸؎ السیرۃ النبویہ، ابن کثیر، ۴/ ۷۰۔

اس حکم کے نازل ہونے کے بعد ۹ ہجری میں حج کے موقع پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یوم النحر میں سورہ براءت کی ابتدائی چار آیات پڑھ کر سنائیں جن میں مشرکین پر اتمام حجت اور ان سے اللہ و رسول کی براءت کا اعلان ہے، اور پھر اعلان کر دیا کہ آج کے بعد نہ کوئی مشرک بیت اللہ میں داخل نہیں ہو سکے گا اور نہ کسی برہنہ کو حج کرنے کی اجازت دی جائے گی۔[۱۹]

کیا اس قسم کی کوئی نص مسجد اقصیٰ اور یہود کے بارے میں بھی قرآن و سنت میں دکھائی جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، بلکہ قرآن و سنت کی تصریحات، سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور فقہا کی آرا میں متعدد قرائن اس دعوے کے خلاف موجود ہیں جن کی تفصیل ہم چند سطور کے بعد پیش کریں گے۔

اس استدلال کی دوسری بنیادی خامی یہ ہے کہ اس میں اہل کتاب کے معاملے کو مشرکین پر قیاس کرتے ہوئے ان نہایت اہم اور واضح فروق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو خود کتاب و سنت کے نصوص میں ان دونوں گروہوں کے مابین ثابت ہیں۔ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ توحید خالص سے انحراف اور مشرکانہ عقائد و اعمال سے آلودہ ہونے کے باوجود قرآن مجید توحید کو اہل کتاب اور اہل اسلام کے درمیان نقطہ اتحاد مانتا اور انھیں اس کی طرف بلانے کا حکم دیتا ہے۔[۲۰]

۲۔ تورات و انجیل کے احکام سے روگردانی کے باوجود وہ اہل کتاب کو اصولی طور پر انھی کتابوں کا پیرو کار تسلیم کرتا اور انھیں 'اہل کتاب' کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

۳۔ اسی بنا پر مشرکین مکہ اور اہل کتاب کے مابین یہ فرق ملحوظ رکھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد مشرکین کو تو اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ ان سے کہا گیا کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں،[۲۱] لیکن اہل کتاب کو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے جزیہ دے کر مسلمانوں کے زیرنگیں رہنے کی اجازت دی گئی۔[۲۲]

۴۔ اسی بنا پر قرآن مجید ان کے اور مشرکین کے مابین یہ امتیاز بھی قائم کرتا ہے کہ مشرکین کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح مسلمانوں کے لیے حرام جبکہ اہل کتاب کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح ان کے لیے جائز ہے۔[۲۳]

۵۔ اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے صنم خانوں اور مقدس مقامات کو اتمام حجت کے بعد ایک ایک

۱۹؎ شبلی نعمانی: سیرت النبی، ۳۳۹/۱۔

۲۰؎ آل عمران: ۶۴۔

۲۱؎ براءۃ: ۵۔

۲۲؎ براءۃ: ۲۹۔

۲۳؎ المائدہ: ۵۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کر کے ڈھا دینے کا حکم دیا، جس کی تفصیل حافظ ابن کثیرؒ نے یوں نقل کی ہے:

''قریش اور بنو کنانہ نے نخلہ کے مقام پر عزیٰ کی عبادت گاہ قائم کر رکھی تھی اور اس کی تولیت و دربانی کی ذمہ داری بنو ہاشم کے حلیف قبیلہ سلیم کے خاندان بنو شیبان کے پاس تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن الولید کو بھیج کر اس کو منہدم کرا دیا۔

بنو ثقیف نے طائف میں لات کی عبادت گاہ بنا رکھی تھی اور اس کے متولی اور خادم بنو معتب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ بن شعبہ اور ابوسفیان صخر بن حرب کو بھیجا جنھوں نے اس کو گرا کر یہاں ایک مسجد بنا دی۔

اوس اور خزرج اور یثرب کے دیگر قبائل نے قدید کے علاقے میں منات کی عبادت گاہ بنا رکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ابوسفیان صخر بن حرب کو، اور ایک قول کے مطابق علی بن ابی طالب کو بھیج کر اس کو گرا دیا۔ (واقدی کی روایت کے مطابق اس کو سعد بن زید الاشہلیؓ نے گرایا تھا)۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر ۴/ ۱۱۷)

قبیلہ دوس، خثعم، بجیلہ اور تبالہ کے علاقے میں دیگر اہل عرب نے ذوالخلصۃ کی عبادت گاہ قائم کر رکھی تھی جس کو وہ کعبہ یمانیہ کے نام سے پکارتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں جریر بن عبداللہ البجلی کو بھیج کر اس کو منہدم کرا دیا۔

سلمیٰ اور آجا کے مابین جبل طے کے قریب قبیلہ طے اور ان کے قریبی قبائل نے فلس کی عبادت گاہ بنا رکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی ابن ابی طالب کو یہاں بھیج کر اس کو گرا دیا۔'' (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۲۵۳، ۲۵۴)

رہاط کے مقام پر قبیلہ ہذیل کی سواع کے نام پر قائم کردہ عبادت گاہ کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے منہدم کیا۔[۲۴]

اس کے برخلاف اہل کتاب کی عبادت گاہوں کی حرمت و تقدس کو پوری طرح تسلیم کرتے ہوئے انھیں مکمل تحفظ فراہم کیا گیا، جس کی آئندہ سطور میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر انبیا کی تعلیمات سے یہود کے عملی انحراف کا اثر مذکورہ بالا تمام امور پر نہیں پڑتا تو صرف مسجد اقصیٰ کی تولیت کے معاملے پر وہ کس قانون، ضابطے اور اصول کی رو سے اثر انداز ہو جاتا ہے؟

علاوہ ازیں اس تضاد کا کیا حل ہے کہ جب اسلام میں اہل کتاب کی عام عبادت گاہوں کو تحفظ دیا گیا اور ان پر اہل مذہب کی تولیت و تصرف کا حق تسلیم کیا گیا ہے تو ان کے قبلہ اور مرکز عبادت کے بارے میں یہ فیصلہ کیوں کیا گیا کہ وہ اس پر تولیت و تصرف یا اس کے اندر عبادت کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتے؟ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی مذہب اور اس کے قبلے کو روحانی لحاظ سے لازم و ملزوم کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، اور اپنے قبلے پر اہل مذہب کے حق کی نفی کا سیدھا سیدھا مطلب خود اس مذہب کے وجود و بقا اور اس کے ماننے والوں کے مذہبی و روحانی بنیاد پر اتحاد و اجتماع کے حق کی نفی ہے۔ علم و منطق کی رو سے ان دونوں باتوں میں کوئی تطبیق نہیں دی جا سکتی کہ ایک مذہب کے لیے بطور مذہب تو وجود و بقا کا حق تسلیم کیا جائے اور

۲۴؎ السیرۃ النبویۃ لابن کثیر ۴/ ۱۱۷۔

اہل مذہب کے روحانی و مذہبی جذبات کے احترام کی تعلیم بھی دی جائے لیکن ساتھ ہی یہ کہہ دیا جائے کہ اپنے قبلے میں عبادت اور اس کی تولیت کا کوئی حق ان کو حاصل نہیں ہے۔ اگر آپ ماننا چاہتے ہیں تو دونوں باتوں کو ماننا ہوگا، اور اگر نفی کرنا چاہتے ہیں تو بھی دونوں باتوں کی کرنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے مشرکین عرب سے محض کعبہ کی تولیت کا حق ہی نہیں چھینا بلکہ اس کے ساتھ ان کے اپنے مذہب پر قائم رہنے کے اختیار کی بھی صاف طور پر نفی فرما دی اور کہا کہ ان کے لیے نجات کی راہ صرف یہ ہے کہ وہ دین حق کو قبول کر لیں۔[۲۵]

حق تولیت کی منسوخی کے خلاف دلائل

اب ہم قرآن وسنت اور تاریخی وفقہی لٹریچر میں موجود ان قرائن کی نشان دہی کرتے ہیں جو حق تولیت کی منسوخی کے مذکورہ دعویٰ کی نفی کرتے ہیں:

اولاً، قرآن مجید نے خود اپنے اسلوب سے یہ واضح کر دیا ہے کہ بہت سے دیگر امور کی طرح، جن کی تفصیل اوپر بیان ہوئی، اللہ کے نبیوں کے تعمیر اور آباد کردہ خانہ خدا کی تولیت کے معاملے میں بھی مشرکین اور اہل کتاب کے مابین فرق کو لازماً ملحوظ رکھا جانا چاہیے چنانچہ مشرکین کے حق تولیت کی تنسیخ کے حکم پر مشتمل سورۂ براءت کی مذکورہ آیت کے ساتھ بالکل متصل اگلی آیت میں اہل کتاب کے بارے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اب ان کی سیاسی قوت وشوکت کو توڑ کر ان کو مسلمانوں کے زیر نگیں ہونے پر مجبور کر دیا جائے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (براءت ۹:۲۹)	’’اہل کتاب کے ساتھ، جو نہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ دین حق کی پیروی اختیار کرتے ہیں، برسر جنگ ہو جاؤ یہاں تک کہ وہ زیردستی قبول کر کے ذلت کی حالت میں جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔‘‘

یہاں دیکھ لیجیے، مشرکین مکہ کے برخلاف اہل کتاب کو محض سیاسی لحاظ سے مغلوب کرنے تک حکم کو محدود رکھا گیا ہے، اور مذہبی مراکز پر ان کے حق تولیت کو اشارۃً بھی چیلنج نہیں کیا گیا۔ اگر مشرکین کی طرح یہود کو بھی مسجد اقصیٰ کی تولیت کے حق سے معزول کرنا مقصود ہوتا تو اس کی تصریح کے لیے اس سے زیادہ موزوں موقع اور کوئی نہیں تھا لیکن، جیسا کہ معلوم ہے، اس قسم کا کوئی حکم یہاں نہیں دیا گیا۔

ثانیاً، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات میں مسجد اقصیٰ کے اس مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالی ہے جو اسے

---

۲۵ براءت ۹:۵۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اسلامی شریعت میں حاصل ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا یہ دنیا کی ان تین مقدس ترین عبادت گاہوں میں سے ایک ہے جن میں عبادت کے لیے انسان کو باقاعدہ سفر کر کے جانا چاہیے:

لا تشد الرحال الا الی ثلاثة مساجد: المسجد الحرام، والمسجد الاقصی، ومسجدی. (بخاری، رقم ۱۱۸۹)	''سامان سفر صرف تین مساجد کے لیے باندھا جائے: مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری مسجد۔''

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے مطابق آپ نے اس میں نماز پڑھنے کا ثواب عام مساجد سے ڈھائی سو گنا زیادہ بیان فرمایا۔[26]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی تکمیل کے موقع پر اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ جو شخص بھی مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کے ارادے سے آئے، وہ یہاں سے اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر جائے جیسے بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔[27] پھر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی ہوگی۔[28]

اس باب میں آپ سے منقول تمام ارشادات اسی نوعیت کے ہیں اور ان میں کہیں بھی مسجد اقصیٰ کی تولیت کی قانونی وشرعی حیثیت کو زیر بحث نہیں لایا گیا اور نہ آپ نے اس حوالے سے صحابہؓ کو کوئی ہدایت دی۔ مثال کے طور پر غزوۂ تبوک کے موقع پر آپ نے صحابہ کرام کو یہ خوشخبری دی کہ آپ کی وفات کے بعد بیت المقدس مفتوح ہوگا۔[29] یہ موقع ایسا تھا کہ اگر مسجد اقصیٰ کی حیثیت میں شرعی نوعیت کی کوئی تبدیلی پیش نظر ہوتی تو اس کے حوالے سے واضح ہدایت دے دینا مناسب تھا۔ اسی طرح اپنے مرض وفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جو بعض اہم وصیتیں کیں، ان میں سے ایک خاص طور پر مراکز اسلام کے ساتھ اہل کتاب کے تعلق کے بارے میں تھی۔ آپ نے فرمایا کہ جزیرۂ عرب میں، جسے اسلام کے مرکز کی حیثیت حاصل ہے، دو دین اکٹھے نہیں ہو سکتے، اس لیے یہود ونصاریٰ کو یہاں سے نکال دیا جائے۔[30] یہ موقع بھی مسجد اقصیٰ کے بارے میں نئی ہدایات دینے کے لیے بالکل موزوں تھا لیکن آپ نے اس حوالے سے اشارۃً بھی کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ثالثاً، حضرات صحابہ کے طرز عمل میں بھی مسجد اقصیٰ کی تقدیس وتکریم سے بڑھ کر اس پر حق تولیت کے تصور کا کوئی سراغ

---

۲۶ مستدرک حاکم، ۴/۵۰۹۔

۲۷ سنن النسائی، رقم ۶۹۴۔

۲۸ ابن ماجہ، رقم ۱۴۰۸۔

۲۹ ابن ماجہ، ۴۰۴۲۔ مسند احمد، روایات معاذ۔

۳۰ مسند احمد، بحوالہ نیل الاوطار ۸/ ۷۳۔

نہیں ملتا، بلکہ حق تولیت تو درکنار، بعض اکابر صحابہ تو بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی کسی خاص فضیلت کے تصور سے بھی نا آشنا تھے۔ حضرت سعد نے فرمایا کہ مسجد قبا میں نماز پڑھنا مجھے بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے زیادہ محبوب ہے۔ حضرت ابوذر غفاری کا ارشاد ہے کہ کسی سرخ ٹیلے پر نماز پڑھ لینا مجھے بیت المقدس میں نماز پڑھنے سے زیادہ پسند ہے۔ حضرت حذیفہ کا قول ہے کہ اگر میں سفر کرتے ہوئے بیت المقدس سے ایک یا دو فرسخ کے فاصلے پر پہنچ جاؤں تو بھی میں وہاں نہیں جاؤں گا اور نہ وہاں جانا مجھے پسند ہے۔ حضرت علی کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں نے بیت المقدس کے ارادے سے ایک اونٹ خریدا ہے اور سامان سفر تیار کر رکھا ہے۔ آپ نے اس سے کہا، اپنا اونٹ بیچ دو اور اس مسجد یعنی مسجد کوفہ میں نماز ادا کر لو، کیونکہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کے بعد مجھے یہ مسجد سب سے زیادہ محبوب ہے۔[۳۱] کسی عبادت گاہ کی فضیلت و مرتبے کا قائل ہونا اس کے ساتھ تعلق اور وابستگی کا کم سے کم درجہ ہے۔ جب یہ جلیل القدر صحابہ اسی سے ناواقف ہیں تو یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی مسجد اقصیٰ کے حق تولیت کے امت مسلمہ کو منتقل ہونے کا کوئی خیال موجود ہو۔

سیدنا عمر کے عہد حکومت میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو امیر المومنین خود یہاں تشریف لائے اور یہاں کے باشندوں کے ساتھ ایک تاریخی معاہدہ کیا۔ اس معاہدے میں فاتحین اور مفتوحین کے باہمی تعلقات اور حقوق وفرائض کے تمام اہم پہلوؤں پر واضح دفعات موجود ہیں حتیٰ کہ مقامی عیسائی بطریق کے اصرار پر یہ شق بھی شامل کی گئی کہ کوئی یہودی ان کے ساتھ بیت المقدس میں قیام نہیں کرے گا،[۳۲] لیکن مسجد اقصیٰ کی تولیت کا معاملہ اس میں بھی زیر بحث نہیں آیا۔ پھر جب سیدنا عمر مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر صخرۂ بیت المقدس کے اوپر اور اس کے ارد گرد پڑے ہوئے کوڑا کرکٹ کو صاف کیا تو اس اہم موقع پر بھی انھوں نے مسجد کی تولیت کے معاملے سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ انھوں نے کعب الاحبار سے محض یہ سادہ سا مشورہ طلب کیا کہ: 'این تری ان اصلی؟'[۳۳] ''تمھاری رائے میں مجھے کس جگہ نماز پڑھنی چاہیے؟'' اور پھر مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں ایک جگہ مخصوص کرنے پر اکتفا کی جس سے واضح ہے کہ اس کو بلا شرکت غیرے مسلمانوں کی تحویل میں دے دینے کا کوئی تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔

رابعاً، اس ضمن میں یہ پہلو بھی کم قابل لحاظ نہیں ہے کہ مسجد حرام اور مسجد نبوی کو مسلمانوں کے دو مقدس ترین اور مخصوص دینی مراکز قرار دینے کے بعد ناگزیر تھا کہ ان مقامات کا یہ تشخص برقرار رکھنے کے لیے وہاں غیر مسلموں کے مستقل قیام کو

۳۱؎ مصنف ابن ابی شیبہ، ۲/ ۳۷۳، ۴/ ۳۷۔

۳۲؎ یہ محض سیاسی نوعیت کی ایک وقتی شرط تھی، چنانچہ بعد کے زمانے میں جب حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی تو مسلمانوں کے اہل حل وعقد نے بھی رفتہ رفتہ اس شہر میں یہودیوں کو قیام کی اجازت دے دی اور اہل علم نے بھی اس پر کوئی نکتۂ اعتراض نہیں اٹھایا۔

۳۳؎ مسند احمد، ۱/ ۳۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ممنوع قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ سیدنا عمر نے یہ ضابطہ بنایا کہ وہ مدینہ منورہ میں غیر مسلموں کو ضرورت کے تحت تین دن سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔[۳۴] یہ روایت پوری اسلامی تاریخ میں قائم رہی ہے۔ لیکن بیت المقدس کے حوالے سے اس قسم کی کوئی ہدایت اسلامی قوانین میں نہیں دی گئی بلکہ پوری مسلم تاریخ میں اس شہر کے ساتھ ان کی وابستگی اور تعلق کو بالعموم احترام ہی کی نظر سے دیکھا گیا اور ان کے وہاں آنے جانے اور وہاں قیام کرنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی، بعض استثنائی اور وقتی وجوہ سے قطع نظر، اصولی طور پر کبھی عائد نہیں کی گئی حتیٰ کہ جب بعض مسلم حکمرانوں نے بیت المقدس کی زیارت کے لیے جانے والے اہل ذمہ پر ایک خاص ٹیکس عائد کیا تو فقہا نے صراحتاً اس کے عدم جواز کا فتویٰ دیا۔[۳۵] اگر مسجد اقصیٰ پر اہل کتاب کی تولیت کو منسوخ کر کے اسے مسلمانوں ہی کے لیے خاص کر دیا گیا ہے تو حرمین شریفین اور بیت المقدس کے احکام میں اس فرق کی آخر کیا توجیہ کی جائے؟

خامساً، فقہ اسلامی کے وسیع اور جامع ذخیرے میں اس بات کی کوئی تصریح، ہمارے علم کی حد تک، نہیں ملتی کہ مسجد اقصیٰ کو اہل کتاب کے تصرف سے نکال کر اہل اسلام کی تولیت میں دے دیا گیا ہے۔ ویسے تو اس نہایت اہم معاملے سے عدم تعرض ہی اس تصور کی نفی کے لیے کافی ہے، لیکن اس سے بڑھ کر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فقہی مکاتب فکر میں سے ایک بڑے مکتب فکر یعنی فقہاے احناف کی آرا میں ایسے شواہد بھی موجود ہیں جو حق تولیت کی تنسیخ کے تصور کی صاف نفی کرتے ہیں۔

اس کا پہلا قرینہ تو اس بحث میں ملتا ہے جو سورۂ براءت کی آیت: 'انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا' کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے فقہا کے ہاں پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں امام مالک، امام احمد اور امام شافعی کا بنیادی زاویۂ نگاہ ایک ہے، یعنی ان سب کے نزدیک اس حکم کی اصل علت، ظاہر نص کے مطابق محض اعتقادی نجاست ہے، البتہ اس حکم کے دائرہ کار کی تحدید کے حوالے سے ان میں باہم اختلاف رائے پایا جاتا ہے:

امام شافعیؒ اس پابندی کو علت اور وقت کے لحاظ سے تو عام مانتے ہیں لیکن محل کے لحاظ سے خاص۔ علت کے عموم کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم اگرچہ مشرکین کے لیے بیان ہوا ہے، لیکن اعتقادی نجاست کی علت چونکہ دوسرے غیر مسلموں میں بھی پائی جاتی ہے، اس لیے کوئی بھی غیر مسلم، چاہے وہ مشرک ہو یا کتابی، مسجد حرام میں داخل نہیں ہو سکتا۔ وقت کے عموم کا مطلب یہ ہے یہ پابندی کسی خاص زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ محل کے خصوص سے مراد یہ ہے کہ امام صاحب اس پابندی کو صرف مسجد حرام کے لیے مانتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام مساجد میں ان کے نزدیک غیر مسلم داخل ہو سکتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ قرآن مجید نے یہ پابندی خاص طور پر صرف مسجد حرام کے لیے بیان کی ہے، لہٰذا باقی مساجد پر

---

[۳۴] موسوعہ فقہ عمر اردو ۳۹۷۔

[۳۵] رد المحتار، کتاب الزکاۃ، باب العاشر فی الزکاۃ ۲/ ۳۱۳۔ نیز کتاب الجہاد، باب المستامن، فصل فی استئمان الکافر ۴/ ۱۶۹۔

اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔[36]

امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی رائے میں یہ حکم علت، وقت اور محل ہر لحاظ سے عام ہے، یعنی ان کے نزدیک تمام غیر مسلموں کا داخلہ مسجد حرام سمیت تمام مساجد میں ہمیشہ کے لیے ممنوع ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ جس طرح اعتقادی نجاست کی علت کی بنا پر یہ حکم مشرکین کے علاوہ دوسرے غیر مسلموں کو بھی شامل ہے، اسی طرح حرمت وتقدس کی علت کی بنا پر مسجد حرام کے علاوہ دیگر تمام مساجد کو بھی شامل ہے۔ اگر غیر مسلم مسجد حرام کی حرمت کی بنا پر اس میں داخل نہیں ہو سکتے، تو اسی علت کی بنا پر دوسری تمام مساجد میں بھی داخل نہیں ہو سکتے۔

فقہائے احناف نے اس حکم کی تعبیر ایک بالکل مختلف زاویے سے کی ہے۔ ان کے نزدیک یہ پابندی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے ان مشرکین عرب کے لیے تھی جن کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں تھا اور جن پر اتمام حجت کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ نیز ان کے لیے بھی یہ ممانعت ہر حال میں نہیں بلکہ حسب ذیل صورتوں میں تھی:

ایک یہ کہ وہ ایام حج میں حج کی غرض سے مسجد حرام میں داخل ہوں۔ گویا عام دنوں میں ان کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں تھی۔[37]

دوسری یہ کہ وہ عریاں ہو کر یا غلبہ اور استیلا کے ساتھ اس میں داخل ہوں۔[38]

تیسری یہ کہ وہ مسجد حرام کے امور میں تصرف وتولیت کے اختیار میں شریک ہوں۔[39]

گویا جمہور فقہا کی رائے کے برعکس، احناف کے نزدیک مسجد حرام میں داخلے کی یہ پابندی نہ تمام غیر مسلموں کے لیے ہے اور نہ ہر زمانے کے لیے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اس حکم کی علت مفرد نہیں بلکہ مرکب ہے، یعنی اس کی وجہ محض اعتقادی نجاست نہیں کہ اس کے دائرۂ اطلاق میں تمام غیر مسلموں اور تمام مساجد کو شامل کر لیا جائے، بلکہ حکم کے سیاق وسباق کی رو سے اعتقادی نجاست کے ساتھ ساتھ پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت بھی اس کی علت کا حصہ ہے۔ چونکہ مذکورہ مشرکین عرب پر ہر لحاظ سے اتمام حجت کر دیا گیا تھا، اس لیے آخری مرحلے میں ان سے اپنے دین پر قائم رہنے کا حق چھین لینے کے ساتھ ساتھ مسجد حرام کی تولیت اور اس میں عبادت کرنے کا حق بھی سلب کر لیا گیا جس کی ایک لازمی فرع یہ تھی کہ اس میں ان کے داخلے پر پابندی عائد کر دی جائے۔

---

[36] احکام القرآن، ابن العربی، ۲/۴۷۰۔

[37] ابو بکر الجصاص، احکام القرآن ۳/۱۳۱۔

[38] ابن ہمام، فتح القدیر، ۱۰/۶۳۔

[39] شرح السیر الکبیر للسرخسی ۱/۱۳۵۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل نکتے کی طرف آتے ہیں۔ احناف تمام مساجد میں غیر مسلموں کے دخول کے جواز کے قائل ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس اجازت کے دائرے میں مسجد اقصیٰ بھی ان کے نزدیک شامل ہے یا نہیں؟ فقہی ذخیرے میں ہمیں اس حوالے سے کوئی صراحت میسر نہیں ہوئی، لیکن منطقی طور پر یہاں امکان دو ہی ہیں:

ایک یہ کہ مذکورہ بحث میں احناف کے پیش نظر مسجد اقصیٰ کے علاوہ باقی مساجد ہیں اور مسجد اقصیٰ اس کے دائرۂ اطلاق سے خارج ہے۔ اگر یہ صورت ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ احناف مسجد اقصیٰ کو ان مساجد کے زمرے میں ہی نہیں سمجھتے جن کے حوالے سے اسلامی شریعت کے احکام زیر بحث آئیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی کہ ان کے نزدیک مسجد اقصیٰ پر مسلمان نہ بلا شرکت غیرے تصرف کا استحقاق رکھتے ہیں اور نہ یک طرفہ طور پر اس پر اسلامی شریعت کے احکام نافذ کرنے کے مجاز ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس بحث کے دائرۂ اطلاق میں مسجد اقصیٰ بھی شامل ہے۔ یہ صورت اس لیے متبادر لگتی ہے کہ جس زمانے میں یہ فقہی بحث پیدا ہوئی، اس وقت مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے تصرف میں تھی اور یہود و نصاریٰ کے عملاً اس سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے اس کو عمومی حیثیت سے منجملہ دیگر مساجد کے ہی سمجھا جاتا تھا۔ اس امکان کو مان لیجیے تو ایک سیدھا سا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسجد اقصیٰ کا حق تولیت اہل کتاب سے چھین لیا گیا ہے تو احناف، جو مسجد حرام میں مشرکین عرب کے دخول کے عدم جواز کو حق تولیت کی تنسیخ کی ایک فرع قرار دیتے ہیں، مسجد اقصیٰ پر اس حکم کا اطلاق کیوں نہیں کرتے؟ کیا ان کے نزدیک اس اصول کا اطلاق اہل کتاب پر نہیں ہوتا؟ اگر ہوتا ہے تو اس کے دائرۂ اطلاق میں صرف عہد نبوی یا عہد صحابہ کے اہل کتاب آتے ہیں یا یہ حکم ہمیشہ کے لیے موثر ہے؟ نیز یہ ممانعت بالکل مطلق ہے یا بعض مخصوص حالات و کیفیات تک محدود ہے؟ اور اگر اہل کتاب پر اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا تو ان کے اور مشرکین کے مابین فرق کی کیا وجہ ہے؟ ان سوالات پر احناف کے ہاں اسی طرح بحث ہونی چاہیے تھی جس طرح مشرکین عرب کے حق تولیت کے حوالے سے ہوئی ہے، بلکہ اس حوالے سے ان پر بحث کا داعیہ اس لحاظ سے زیادہ قوی تھا کہ مشرکین عرب کا خاتمہ تو عہد نبوی اور عہد صحابہ میں ہی کر دیا گیا تھا، اور بعد کے حالات میں ان کے مسجد حرام میں دخول یا عدم دخول کی بحث محض نظری نوعیت کی تھی، جبکہ یہود بطور ایک مذہبی گروہ کے اس اعتقاد کے ساتھ مسلسل دنیا میں موجود ہیں کہ مسجد اقصیٰ ان کا قبلہ ہے اور ایک وقت آئے گا جب وہ یہاں اپنے ہیکل کو از سر نو تعمیر کریں گے۔

اس پس منظر کے ساتھ جب ہم فقہاے احناف کی طرف رجوع کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ان سوالات کے حوالے سے کسی تفصیل میں جائے بغیر مسجد اقصیٰ میں اہل کتاب کے دخول کو جائز قرار دیتے ہیں تو اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ ان کے ذہن میں اہل کتاب کے حق تولیت کی تنسیخ کا کوئی تصور موجود نہیں۔

باقی رہا یہ سوال کہ احناف اور شوافع نہ سہی، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک تو مسجد اقصیٰ میں اہل کتاب کے دخول کے عدم

جواز کا حکم بہرحال ثابت ہے، تو اس سے ہمارے موقف پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک اس کی علت حق تولیت کی تنسیخ نہیں بلکہ اعتقادی نجاست ہے۔ ہم یہاں جو بات واضح کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے حق تولیت کی تنسیخ کا ذکر فقہا کے ہاں، خواہ وہ احناف اور شوافع ہوں یا مالکیہ اور حنابلہ، نہیں ملتا۔ مالکیہ اور حنابلہ اگر اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے، مثلاً غیر مسلموں کی اعتقادی نجاست کی بنیاد پر مسجد اقصیٰ میں اہل کتاب کے دخول کے عدم جواز کے قائل ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ ایک بالکل دوسری بحث ہے اور اس ضمن میں یہ ان سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر مسجد اقصیٰ کا بلاشرکت غیرے مسلمانوں ہی کی عبادت گاہ ہونا از روے شریعت ثابت نہیں ہے، تو اس پر مسلمانوں کی مخصوص مساجد کے احکام جاری کرتے ہوئے اہل کتاب پر یہ پابندی کیونکر عائد کی جا سکتی ہے؟

حق تولیت کی تنسیخ کے خلاف دوسرا قرینہ فقہاے احناف کے ہاں اس فقہی بحث میں ملتا ہے کہ اسلامی ریاست میں اہل ذمہ کو اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر و تزئین یا انتظام امور کے لیے مال وقف کرنے یا وصیت کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ جمہور فقہا کی رائے میں انھیں نہ اپنی عبادت گاہوں کے لیے یہ حق حاصل ہے اور نہ مسلمانوں کی مساجد کے لیے۔ اگر وہ ایسی کوئی وصیت کریں تو اسے غیر موثر سمجھا جائے گا۔[۴۰]

فقہاے احناف کے ہاں، البتہ، اس میں کچھ تفصیل ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

> ''جان لو کہ ذمی کی وصیت کی تین صورتیں ہیں: پہلی صورت بالاتفاق جائز ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کسی ایسے کام کی وصیت کرے جو ہمارے نزدیک بھی باعث ثواب ہو اور ان کے نزدیک بھی، مثلاً یہ وصیت کرے کہ اس کے مال سے بیت المقدس میں چراغ جلائے جائیں یا وصیت کرنے والا رومی ہو اور وصیت کرے کہ اس کے مال سے ترکوں کے خلاف لڑائی کی جائے۔ یہ وصیت خواہ وہ کچھ مخصوص لوگوں کے حق میں کرے یا عمومی طور پر، دونوں صورتوں میں درست ہوگی۔ دوسری صورت بالاتفاق باطل ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کسی ایسے کام کی وصیت کرے جو نہ ہمارے نزدیک باعث ثواب ہو اور نہ ان کے نزدیک، مثلاً گانا گانے والیوں یا نوحہ کرنے والیوں کے حق میں وصیت کر دے۔ اسی طرح اگر وہ کسی ایسے کام کے لیے وصیت کریں جو صرف ہمارے نزدیک باعث ثواب ہے، جیسے حج اور مسلمانوں کے لیے مساجد تعمیر کرنا، تو ان کی وصیت درست نہیں۔ تیسری صورت میں اختلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی ایسے کام کی وصیت کرے جو صرف ان کے ہاں باعث ثواب ہو جیسے گرجا تعمیر کرنا۔ اگر یہ وصیت وہ غیر معین لوگوں کے نام کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک درست ہوگی جبکہ صاحبین کے نزدیک نادرست۔ اور اگر چند معین افراد کے نام کرے تو بالاتفاق درست قرار پائے گی۔''
>
> (ردالمحتار، کتاب الوصایا، فصل فی وصایا الذمی وغیرہ، ۶/۶۹۶)

۴۰؎ مغنی المحتاج، محمد بن احمد الشربینی الخطیب، ۳/، کتاب الوقف۔ الشرح الکبیر، ۴/۷۸، ۷۹، باب فی احکام الوقف۔ المغنی، ابن قدامہ، ۶/۱۲۲، مسئلہ ۴۳۷۰۔ کشاف القناع عن متن الاقناع، ۴/۳۶۴۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسی طرح اہل ذمہ کے وقف کی صورتیں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بحر الرائق وغیرہ میں ہے کہ ذمی کے وقف کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ کسی ایسے کام کے لیے وقف کرے جو ہمارے نزدیک بھی نیکی کا کام ہو اور ان کے نزدیک بھی، جیسے فقرا کے حق میں یا مسجد اقصیٰ کے لیے۔ اگر وہ کسی گرجے پر وقف کرے تو درست نہیں کیونکہ یہ صرف ان کے نزدیک نیکی ہے۔ اسی طرح اس کا حج اور عمرہ کے لیے مال وقف کرنا بھی درست نہیں کیونکہ وہ صرف ہمارے نزدیک نیکی ہے۔''

(ردالمحتار، کتاب الوقف، مطلب قد یثبت الوقف بالضرورۃ، ۳۴۱/۴)

یہی بات ابن ہمام نے 'فتح القدیر' میں یوں بیان کی ہے:

''اگر ذمی نے اس مقصد کے لیے مال وقف کیا کہ اس کے ساتھ حج یا عمرہ کیا جائے تو یہ جائز نہیں کیونکہ حج اور عمرہ ان کے نزدیک قرب الٰہی کا ذریعہ نہیں ہیں۔ ہاں اگر وہ مسجد اقصیٰ کے لیے مال وقف کرے تو جائز ہے کیونکہ یہ ان کے نزدیک بھی کار ثواب ہے اور ہمارے نزدیک بھی۔'' (فتح القدیر، کتاب الشرکۃ، فصل: لا یودی احد الشریکین زکاۃ مال، ۲۰۱/۶)

یہاں اس جزئیہ کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں، لیکن اس سے اتنی بات بالکل واضح ہے کہ فقہاے احناف کے نزدیک مسجد اقصیٰ کا معاملہ مسلمانوں کی عام مساجد سے مختلف ہے۔ عام مساجد کے لیے وہ اہل ذمہ کے وقف یا وصیت کردہ مال کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کی حیثیت خالصتاً مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی ہے اور ان پر خرچ کرنا چونکہ اہل ذمہ کے نزدیک کار ثواب نہیں ہے اس لیے ان کے حق میں ان کی وصیت یا وقف بھی درست نہیں، لیکن مسجد اقصیٰ پر خرچ کرنے کے لیے وہ اہل ذمہ کے وقف اور وصیت کو درست قرار دیتے ہیں جس کا مفہوم، ظاہر ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس کو خالصتاً اہل اسلام کی نہیں بلکہ اہل اسلام اور اہل کتاب دونوں کی مشترکہ عبادت گاہ مانتے اور اس کی تعمیر وتزئین کے لیے مال خرچ کرنے کو اہل کتاب کا مذہبی حق تسلیم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل کتاب کے حق تولیت کو ازروئے شریعت منسوخ ماننے کی صورت میں 'اشتراک' کے اس تصور کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا۔

اس کے بالمقابل دوسرا گروہ دوسری تمام مساجد کی طرح مسجد اقصیٰ میں بھی غیر مسلموں کے دخول کے عدم جواز کا قائل ہے لیکن اس ضمن میں وہ حق تولیت کی تنسیخ کے حوالے سے مسجد اقصیٰ کو خصوصی طور پر زیر بحث لائے بغیر محض عمومی نوعیت کا یہ استدلال کرنے پر اکتفا کرتا ہے کہ چونکہ غیر مسلم اعتقادی طور پر ناپاک ہیں اس لیے وہ کسی بھی مسجد میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اگر اس گروہ کے ذہن میں بھی حق تولیت کی تنسیخ کا کوئی تصور ہوتا تو یقیناً وہ اس بحث میں اس کو بطور دلیل پیش کرتا کیونکہ حق تولیت سے معزولی کی خصوصی دلیل اعتقادی نجاست کی عمومی دلیل سے کہیں زیادہ وزنی اور مضبوط ہے۔

[باقی]

ریحان احمد یوسفی

عروج وزوال کا قانون ـــــ تاریخ کی روشنی میں

(۵)

امت مسلمہ سے متعلق عروج وزوال کا ضابطہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امت مسلمہ کا پس منظر

اس سے قبل کہ ہم امت مسلمہ کے عروج وزوال کے ضمن میں قرآن کا قانون واضح کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی تشکیل کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کو آزمایش کے لیے بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آزمایش میں انسانیت کی مدد کے لیے متعدد اہتمام کیے۔ ان میں سے ایک آخری درجہ کا اہتمام وہ تھا جس کا تفصیلی ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ یعنی ایک رسول کو اس کی قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اور وہ آخرت میں ہونے والی سزا و جزا کی داستان کو اس دنیا میں عملاً برپا کر کے دکھا دیتا ہے۔ اس طرح رسول کی قوم دنیا کے لیے ایک حسی نشان بن جاتی ہے کہ جس طرح دنیا میں خدا کے رسول کی نافرمانی پر تباہی آتی ہے اور فرماں برداری پر غلبہ نصیب ہوتا ہے، اسی طرح قیامت کے دن خدا کے فرماں برداروں کا مقدر ابدی عروج اور نافرمانوں کا مقدر ابدی زوال ہوگا۔

تاہم آزمایش کی اس دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا کہ ایک رسول کے ماننے والے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان برائیوں، خصوصاً شرک میں مبتلا ہوتے چلے گئے جو دنیا میں پھیلی ہوئی تھیں اور حق محض تاریخ کی ایک داستان بن کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ قدیم دنیا میں ایک دوسری صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت کی کم و بیش تمام متمدن دنیا میں حکومتی

طاقت شرک کی محافظ تھی اور اہل حق کو مذہبی تعذیب کا نشانہ بنا کر توحید کے راستے سے روکا جاتا تھا۔ اس طرح حق کے آزادانہ طور پر پنپنے کے امکانات ہی ختم ہو چلے تھے جو کہ اللہ تعالیٰ کی اس اسکیم کے خلاف تھا جس کے تحت انسان کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی سے حق کے ردو قبول کا فیصلہ کر سکے۔

ہمارے پاس جو معلوم تاریخی ریکارڈ ہے، وہ تقریباً اسی عرصے میں منضبط ہونا شروع ہوا ہے۔ اسی لیے وہ لوگوں کے عقائد کی داستان ہمیشہ شرک کے حوالے سے سناتا ہے۔ حالانکہ قرآن نے اس دور کے رسولوں اور ان کی اقوام کی جو داستان بیان کی ہے، مثلاً ہود، صالح، لوط اور شعیب وغیرہ اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ حق و باطل کا معرکہ ہمیشہ کی طرح اس دور میں بھی جاری تھا۔ بد اعتقادی اور بد اعمالی کا غلبہ اس قدر ہوتا تھا کہ قوم تباہ ہو جاتی تھی، مگر حق قبول نہ کرتی تھی۔ یعنی انسانیت توحید کی راہ سے اس طرح اتری کہ اس کا واپس آنا بہت مشکل ہو چکا تھا۔

ان حالات میں آج سے تقریباً چار ہزار سال قبل اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت ابراہیم کو کار رسالت کے ساتھ ایک دوسری ذمہ داری کے لیے قبول کیا۔ وہ ذمہ داری یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں مختلف آزمایشوں سے گزارا اور جب وہ ان میں کامیاب ہو گئے تو انھیں انسانیت کی امامت کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس امامت کے نتیجے میں نبوت و رسالت کا سلسلہ آپ کی اولاد میں خاص کر دیا گیا اور آپ کی اولاد میں سے دو عظیم الشان امتیں اٹھانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان امتوں کی تاسیس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ شرک کی ان زنجیروں کو بالجبر توڑ ڈالیں جنھوں نے انسانیت کو صدیوں سے جکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ان کی شکل میں ایک ایسا معاشرہ ہر دور میں انسانوں کے سامنے رہے جو توحید کی بنیاد پر قائم ہو اور جہاں اللہ کے نبیوں کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق لوگ ایک خدا پرستانہ زندگی گزارتے ہوں۔ اس طرح وہ حق کی شمع کی صورت، ظلمتوں میں بھٹکے ہوؤں کے لیے منزل کا نشان بن کر، ہمیشہ روشن رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کے عروج کو اپنی فرماں برداری اور ان کے زوال کو اپنی نافرمانی سے مشروط کر دیا۔ اس طرح حق لوگوں کے لیے تاریخ کی ایک سنی سنائی داستان نہ رہا، بلکہ حال کی ایک زندہ تصویر بن کر ان کے سامنے مجسم ہو گیا کہ کس طرح خدا اپنے فرماں برداروں پر رحمتیں اور غداروں پر عذاب نازل کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم کی امامت

قرآن میں حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کے نصب امامت کا واقعہ یوں بیان ہوا ہے:

''اور (یاد کرو) جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں۔ فرمایا: بے شک میں تمھیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا: اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا: میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔'' (البقرہ ۲:۱۲۴)

اس آیت میں نہ صرف حضرت ابراہیم کے امام بنائے جانے کا بیان ہے، بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اولادِ ابراہیم کے لیے نصبِ امامت کا ضابطہ وہی ہے جو ابراہیم کے لیے تھا۔ یعنی جس طرح ابراہیم کو اس کے رب نے آزمایا، اسی طرح اولادِ ابراہیم کو بھی آزمایا جائے گا۔ جو لوگ اس امتحان میں پورے اترے، انھیں دنیا میں عروج واقتدار نصیب ہوگا۔ جنھوں نے ظلم و نافرمانی کی راہ اختیار کی وہ اس منصب کے حق دار نہیں۔ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی پوری تاریخ کا فلسفہ اسی ایک آیت میں بیان ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم آگے چل کر ان دونوں کی تاریخ سے یہ بات دکھائیں گے کہ عالم اسباب میں رہتے ہوئے، ان کا عروج وزوال خدا سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری سے وابستہ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی روشنی میں حضرت ابراہیم کو بڑھاپے میں دو عظیم بیٹے اور پیغمبر اسمٰعیل اور اسحاق عطا کیے گئے۔ انھیں اپنے اس مقام کا بخوبی احساس تھا۔ چنانچہ عقیدہ اور عمل کی سطح پر خدا سے وفادار رہنے پر اپنی اولاد کو متنبہ کرنا اور خدا سے اس کے لیے دعا کرنا حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا خاصہ رہا ہے۔

ان میں سے چھوٹے صاحب زادے اسحاق کو کنعان (موجودہ فلسطین) کے علاقے میں آباد کیا گیا اور پہلے انھی کی اولاد کو منصب امامت سے سرفراز کیا گیا۔ جبکہ بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو اللہ کے حکم کے مطابق مکہ کی وادی غیر ذی زرع میں ان کی والدہ محترمہ ہاجرہ کے ہمراہ آباد کر دیا گیا۔ اس موقع پر جو شان دار دعا حضرت ابراہیم نے فرمائی، وہ اس بات کا بھی اظہار ہے کہ آپ کی ذریت کا اصل مشن توحید سے عقیدہ اور عمل کی سطح پر وفاداری اور اس کی بنیاد پر ایک خدا پرستانہ معاشرے کا قیام ہے اور جو لوگ اس ضمن میں آپ کی پیروی نہیں کریں گے، ان کا آپ سے کوئی تعلق نہیں:

> ''اور (یاد کرو) جب ابراہیم نے دعا کی: اے میرے رب، اس سر زمین کو پر امن بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے محفوظ رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے تو جو میری پیروی کرے، وہ مجھ سے ہے۔ اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے میرے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے ایک بن کھیتی کی وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے۔ اے میرے رب، تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں۔ تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں۔ اے میرے رب، تو جانتا ہے جو ہم پوشیدہ رکھتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں نہ زمین میں اور نہ آسمان میں۔ شکر ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔ بے شک میرا رب دعا کا سننے والا ہے۔ اے میرے رب، مجھے نماز کا اہتمام کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔ اے میرے رب، اور میری دعا قبول فرما۔''
>
> (ابراہیم ۱۴: ۳۵۔۴۱)

آل ابراہیم کا عروج وزوال

امامت کے اس منصب کا مطلب خدا کی کسی قوم سے خصوصی قرابت نہیں کہ ہر حال میں اس قوم کی مدد کرے، بلکہ یہ پورا

معاملہ آزمایش کے اصول پر کیا گیا تھا۔ چنانچہ نزول قرآن کے وقت خدا نے یہ واضح کر دیا کہ نافرمانی کی صورت میں وہ ماضی میں عذاب دینے میں کبھی جھجکا ہے اور نہ مستقبل میں جھجکے گا۔ بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل، دونوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''نہ تمھاری آرزووں سے کچھ ہونے کا ہے نہ اہل کتاب کی۔ جو کوئی برائی کرے گا، اس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہیں پائے گا۔'' (النساء۴: ۱۲۳)

سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) میں بنی اسرائیل کے عروج وزوال کی داستان بیان کی گئی اور اسے ان کے اعمال سے منسوب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی بار کی میعاد آئی تو ہم نے تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیے تو وہ گھروں میں گھس پڑے اور شدنی وعدہ پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور تمھاری مال واولاد سے مدد کی اور تمھیں ایک کثیر التعداد جماعت بنا دیا۔ اگر تم بھلے کام کرو گے تو اپنے لیے اور اگر برے کام کرو گے تو بھی اپنے لیے۔ پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا (تو ہم نے تم پر اپنے زور آور بندے مسلط کر دیے) تا کہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور تا کہ وہ مسجد میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تا کہ جس چیز پر ان کا زور چلے اسے تہس نہس کر ڈالیں۔ کیا عجب کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے۔ اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم بھی وہی کریں گے۔'' (بنی اسرائیل ۱۷: ۴۔۸)

بنی اسرائیل کے بعد بنی اسماعیل کو منصب امامت پر فائز کیا گیا اور انھیں بتا دیا گیا کہ ایسا نہیں ہے کہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کے بعد خدا کے پاس اور لوگ نہیں بچے کہ وہ ہر حال میں ان کے ناز نخرے اٹھاتا رہے گا۔ فرمایا:

''ایمان والو، جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا (تو اللہ کو کوئی پروا نہیں)، وہ جلد ایسے لوگوں کو اٹھائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، وہ مسلمانوں کے لیے نرم مزاج اور کافروں کے لیے سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جس کو چاہے بخشے گا۔ اور اللہ بڑی سمائی رکھنے ولا اور علم والا ہے۔'' (المائدہ ۵: ۵۴)

اس تنبیہ کے ساتھ خدا سے وفاداری کی صورت میں حکومت واقتدار کا وعدہ بنی اسماعیل سے اس طرح کیا گیا:

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں اقتدار بخشے گا، جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھیرایا، اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھیرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔''

(النور ۲۴: ۵۵)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آل ابراہیم سے لیا گیا عہد

قرآن کے ابتدائی حصہ میں موجود سورۂ بقرہ وہ مقام ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے امامت کے منصب سے ان دونوں امتوں کے نصب وعزل کی کہانی اور خدا سے وفاداری کے اس میثاق کا تذکرہ کیا ہے جو ان دونوں سے لیا گیا۔ ابتدائی تمہید کے بعد سورہ کے ابتدائی حصے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کیا اور اس عہد کی پاس داری کی طرف انھیں متوجہ کیا جو وہ خدا سے کر چکے ہیں۔ فرمایا:

''اے بنی اسرائیل، یاد کرو میری اس نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھی سے ڈرو۔'' (البقرہ ۲:۴۰)

اس کے بعد ان کی تاریخ کے بعض اہم واقعات کے حوالے سے ان پر فرد جرم عائد کی گئی ہے۔ اسی تذکرے میں بنی اسرائیل کے دوسرے جرائم کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل سے متعدد عہد لیے گئے تھے، مگر وہ ہر دفعہ عہد شکن ثابت ہوئے۔ ان میں سے خصوصاً شریعت کی پاس داری کا عہد بڑے غیر معمولی حالات میں لیا گیا تھا:

''اور (یاد کرو) جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا اور تمھارے اوپر طور کو اٹھایا (اور حکم دیا کہ) جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے، اس کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو (اور مانو)۔ انھوں نے کہا: ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔'' (البقرہ ۲:۹۳)

ان کے اس جواب 'سمعنا و عصینا' کے مقابلے میں ہم آگے چل کر ایسے ہی میثاق کے موقع پر بنی اسماعیل کا جواب بھی نقل کریں گے جو اس کے بالکل متضاد ہوگا۔ پھر اس سورہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ امامت کا منصب اصل میں سیدنا ابراہیم کو دیا گیا تھا اور ابراہیم و اسماعیل کی نسل سے ایک امت مسلمہ کی بعثت پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں شامل تھی۔ اب یہ منصب بنی اسرائیل سے ان کی نافرمانی کے نتیجے میں سلب کیا جا رہا ہے اور آل ابراہیم کی دوسری شاخ یعنی بنی اسماعیل میں منتقل کیا جا رہا ہے، جنھوں نے توحید کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ تحویل قبلہ کا حکم (یعنی بیت المقدس سے بیت اللہ کو قبلہ بنانے کا حکم) اس کی علامت تھی جس کے فوراً بعد بنی اسماعیل کو اس منصب پر فائز کرنے کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

''اور اسی طرح (یعنی جس طرح ہم نے بنی اسرائیل کو اس منصب پر فائز کیا تھا) ہم نے تمھیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔'' (البقرہ ۲:۱۴۳)

یہ بات زیادہ صراحت سے سورۂ حج (۲۲) آیات ۷۵۔۷۸ میں بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد سورہ کے آخر تک شریعت کے احکامات دیے گئے ہیں تاکہ اس خدا پرستانہ معاشرہ کی بنیادیں دنیا کے سامنے آ جائیں۔ سورہ کے آخر میں شریعت سے پاس داری کے ان کے اقرار کا بیان اس طرح ہے:

''رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر۔ (ان کا اقرار ہے کہ) ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔'' (البقرہ ۲:۲۸۶)

صحابۂ کرام نے بنی اسرائیل کے 'سمعنا و عصینا ' کے برعکس 'سمعنا و اطعنا' کے الفاظ کہے۔ یہی وہ الفاظ اور عہد ہے جس کی یاددہانی شریعت کے آخری احکامات اترتے وقت اس طرح کرائی گئی:

''اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جب تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (المائدہ ۵:۷)

آل ابراہیم کا عروج و زوال ــــــ تاریخ کی روشنی میں

ہمیں اس باب میں صرف قرآن کے حوالے سے ہی قانونِ عروج و زوال بیان کرنا تھا، مگر مذکورہ بالا قرآنی بیانات کو تاریخی حقائق کی روشنی میں بیان کرنا بھی اپنے اندر افادیت کا پہلو رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس اعتبار سے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر لوگوں کو آگاہی حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ ذیل میں ہم بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل کی تاریخ انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں جس سے یہ بات بالکل مبرہن ہو کر سامنے آجائے گی کہ بنی اسرائیل اور اسی طرح بنی اسماعیل کا عروج و زوال خدا کی اطاعت سے مشروط رہا ہے۔ جب تک انھوں نے ایسا کیا خدا نے انھیں عزت و سرفرازی نصیب فرمائی اور جب انھوں نے اس سے پہلو تہی کی تو خدائی عذاب کا کوڑا ان پر برس گیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بنی اسرائیل کی تاریخ

حضرت اسحاق کے بیٹے یعقوب ایک نبی تھے۔ آپ کا لقب اسرائیل (خدا کا بندہ) تھا۔ اسی بنا پر آپ کی اولاد کو بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ آپ کے بارہ بیٹے تھے جن میں سے حضرت یوسف نبی تھے۔ قرآن کی سورۂ یوسف میں بالتفصیل آپ کا قصہ بیان ہوا جس میں بتایا گیا ہے کہ انھی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر میں منتقل کیا جو اس وقت تہذیب انسانی کا سب سے بڑا مرکز اور شرک کا گڑھ تھا۔ آپ عملاً مصر کے حاکم مطلق تھے۔ اس لیے آپ کے خاندان کو وہاں غیر معمولی تکریم نصیب ہوئی۔ چنانچہ ان لوگوں نے ان مقاصد کی تکمیل شروع کر دی جس کے لیے ان کو چنا گیا تھا اور وہ مصر کی مشرکانہ اور اخلاق باختہ سوسائٹی میں حق کا نمونہ بن کر رہنے لگے۔ تاہم انھیں مصر کی مشرکانہ تہذیب کے اثرات سے بچانے کے لیے مصریوں سے الگ تھلگ جشن کی زمین میں بسایا گیا۔ (پیدایش ۴۷:۶)

تاہم کئی صدیوں تک مصر کی مشرکانہ سوسائٹی میں رہنے کے بعد بنی اسرائیل میں شرک کے جراثیم سرایت کر گئے۔ اور وہ اس مقصد کو پورا کرنے کے قابل نہیں رہے کہ مصریوں پر حق کی شہادت دے سکیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ مصر میں اس دوران میں ایک زبردست سیاسی تبدیلی رونما ہوگئی۔ حضرت یوسف کے زمانے میں ہکساس (HYKSOS) یعنی چرواہے بادشاہوں کی حکومت تھی جو عربی النسل تھے۔ ان کے بعد قبطی قوم اقتدار پر قابض ہوگئی جس کے ساتھ بنی اسرائیل کے لیے بھی

سخت وقت شروع ہو گیا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بحیثیت رسول دوطرفہ مشن کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ آپ کی بعثت کا ایک پہلو تو وہی تھا جو تمام رسولوں کی بعثت کا ہوا کرتا ہے۔ یعنی فرعون اور اس کے حواریوں پر اتمام حجت کرنا۔ دوسرا یہ کہ بنی اسرائیل کو قبطیوں کی غلامی سے نجات دلا کر انھیں بحیثیت امت پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا۔

حضرت موسیٰ پر ان کی قوم ایمان لے آئی۔ فرعون پر اتمام حجت کے بعد آل فرعون کو ہلاک کر دیا گیا اور بنی اسرائیل کو نہ صرف مصریوں کی غلامی سے رہائی مل گئی، بلکہ انھیں کتاب و شریعت کی نعمت سے سرفراز کرنے اور حکومت و اقتدار پر فائز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ حضرت موسیٰ کی دعوت پر لبیک کہنے اور اس راہ میں پیش آنے والی سختیوں پر صبر کا نقد انعام تھا (الاعراف ۷: ۱۳۷)۔ مصر سے نکلنے کے بعد صحراے سینا میں ان کے لیے پانی اور من وسلویٰ کا بندوبست کیا گیا۔ آسمان کے بادل دھوپ سے بچانے کے لیے ان پر سایہ فگن کر دیے گئے۔

اس موقع پر بہت مناسب ہوگا کہ اس عہد و پیمان کی تفصیل بیان کر دی جائے جو بنی اسرائیل کو شریعت دیتے وقت لیا گیا تھا۔ اس کا ذکر استثنا میں کئی جگہ کیا گیا ہے، تاہم باب ۲۸ میں اس کی تفصیل اس طرح کی گئی ہے:

''اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جاں فشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں، احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا۔ اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ہوگا۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے چوپایوں کے بچے یعنی گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے مبارک ہوں گے۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی، دونوں مبارک ہوں گے۔ اور تو اندر آتے وقت مبارک ہوگا اور باہر جاتے وقت بھی مبارک ہوگا۔ خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں تیرے روبرو شکست دلائے گا۔ وہ تیرے مقابلہ کو تو ایک ہی راستہ سے آئیں گے پر سات سات راستوں سے ہو کر تیرے آگے سے بھاگیں گے۔ خداوند تیرے انبار خانوں میں اور سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگائے برکت کا حکم دے گا اور خداوند تیرا خدا اس ملک میں جسے وہ تجھ کو دیتا ہے، تجھے بخشے گا۔ اگر تو خداوند اپنے خدا کے حکموں کو مانے اور اس کی راہوں پر چلے تو خداوند اپنی اس قسم کے مطابق جو اس نے تجھ سے کھائی تجھ کو اپنی پاک قوم بنا کر قائم رکھے گا۔ اور دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈر جائیں گی۔ اور جس ملک کو تجھ کو دینے کی قسم خداوند نے تیرے باپ دادا سے کھائی تھی، اس میں خداوند تیری اولاد کو اور تیرے چوپایوں کے بچوں کو اور تیری زمین کی پیداوار کو خوب بڑھا کر تجھ کو برومند کرے گا۔ خداوند آسمان کو جو اس کا اچھا خزانہ ہے، تیرے لیے کھول دے گا کہ تیرے ملک میں وقت پر مینہ برسائے اور وہ تیرے سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگائے برکت دے گا اور تو بہت سی قوموں کو قرض دے گا پر خود قرض نہیں لے گا۔ اور خداوند تجھ کو دم نہیں، بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تو پست نہیں، بلکہ سرفراز ہی رہے گا بشرطیکہ تو خداوند اپنے خدا کے حکموں کو جو میں تجھ کو آج کے دن دیتا ہوں سنے اور احتیاط سے ان پر عمل کرے۔ اور جن باتوں کا میں آج کے دن تجھ کو حکم دیتا ہوں، ان میں سے کسی سے دہنے یا بائیں ہاتھ مڑ کر اور معبودوں کی پیروی اور عبادت نہ کرے۔

لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ پر لگیں گی۔ شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی تو لعنتی ہو گا۔ تیرا ٹوکرا اور تیری کٹھوتی دونوں لعنتی ٹھیریں گے۔ تیری اولاد اور تیری زمین کی پیداوار اور تیرے گائے بیل کی بڑھتی اور تیری بھیڑ بکریوں کے بچے لعنتی ہوں گے۔ تو اندر آتے لعنتی ٹھیرے گا اور باہر جاتے بھی لعنتی ٹھیرے گا۔ خداوند ان سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور اضطراب اور پھٹکار کو تجھ پر نازل کرے گا، جب تک کہ تو ہلاک ہو کر جلد نیست و نابود نہ ہو جائے۔ یہ تیری ان بداعمالیوں کے سبب سے ہوگا جن کو کرنے کی وجہ سے تو مجھ کو چھوڑ دے گا۔ خداوند ایسا کرے گا کہ وبا تجھ سے لپٹی رہے گی۔ جب تک کہ وہ تجھ کو اس ملک سے جس پر قبضہ کرنے کو تو وہاں جا رہا ہے فنا نہ کر دے۔ خداوند تجھ کو تپ دق اور بخار اور سوزش اور شدید حرارت اور تلوار اور بادِ سموم اور گیروئی سے مارے گا اور یہ تیرے پیچھے پڑے رہیں گے، جب تک کہ تو فنا نہ ہو جائے۔ اور آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی۔ خداوند مینہ کے بدلے تیری زمین پر خاک و دھول برسائے گا یہ آسمان سے تجھ پر پڑتی ہی رہیں گی، جب تک کہ تو ہلاک نہ ہو جائے۔ خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائے گا۔ تو ان کے مقابلے کے لیے تو ایک ہی راستہ سے جائے گا اور ان کے سامنے سے سات سات راستوں سے ہو کر بھاگے گا اور دنیا کی تمام سلطنتوں میں تو مارا مارا پھرے گا۔ اور تیری لاش ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہوگی اور کوئی ان کو ہنکا کر بھگانے کو بھی نہ ہوگا... اور تو اپنے سب دھندوں میں ناکام رہے گا اور تجھ پر ہمیشہ ظلم ہی ہوگا اور تو لٹتا ہی رہے گا اور کوئی نہ ہوگا جو تجھ کو بچائے۔ عورت سے منگنی تو تو کرے گا اور دوسرا اس سے مباشرت کرے گا۔ تو گھر بنائے گا پر اس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائے گا اور اس کا پھل استعمال نہ کرے گا... تیرے بیٹے اور بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کے لیے ترستی رہ جائیں گی ... اگر تو اس شریعت کی ان سب باتوں پر جو اس کتاب میں لکھی ہیں احتیاط رکھ کر اس طرح عمل نہ کرے کہ تجھ کو خداوند اپنے خدا کے جلالی اور مہیب نام کا خوف ہو تو خداوند تجھ پر عجیب آفتیں نازل کرے گا اور تیری اولاد کی آفتوں کی بڑھا کر اور بڑی اور دیرپا آفتیں اور سخت اور دیرپا بیماریاں کر دے گا۔'' (استثنا: ۲۸)

بنی اسرائیل کی پوری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خدا سے وفاداری اور شریعت کی پاس داری کے اس عہد کی آخری درجہ میں پابندی کی ہے۔ جب جب انھوں نے غداری و سرکشی کی تو ان پر بدترین عذاب مسلط کر دیے گئے اور وفاداری کی صورت میں ان پر انعام و اکرام کے دروازے کھول دیے گئے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں بنی اسرائیل کو سزا و جزا کی یہی داستان سنائی گئی ہے۔

اس داستان کا آغاز حضرت موسیٰ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ آپ کے زمانے میں ان پر انعام و اکرام کا معاملہ تو اوپر بیان ہو گیا کہ نہ صرف فرعون سے انھیں نجات دلائی گئی، بلکہ صحرا میں ان کے کھانے پینے اور ان پر سائے کے لیے غیر معمولی انتظامات کیے گئے۔ تاہم جب حضرت موسیٰ کوہِ طور پر گئے اور ان کے پیچھے بنی اسرائیل بچھڑے کو خدا بنا بیٹھے تو انھیں اس جرم پر شدید عذاب دیا گیا۔ اس طرح کہ تمام مجرموں کو ان کے ہم قبیلہ اور خاندان کے لوگوں نے قتل کیا (البقرہ ۲: ۵۴،

خروج ۳۲:۲۵۔۳۰)۔اسی طرح جب انھوں نے جہاد پر جانے کے حضرت موسیٰ کے حکم کے معاملے میں بزدلی دکھائی تو فلسطین کی زمین چالیس سال کے لیے ان پر حرام کر کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔(المائدہ ۵:۲۶)۔

حضرت موسیٰ کے جانشین حضرت یوشع بن نون ہوئے اوران کے زمانے میں بنی اسرائیل نے شام وفلسطین کو فتح کرلیا۔ یوں خدا کا وہ وعدہ ان کے حق میں پورا ہوا جو اس مقدس سرزمین کے بارے میں ان سے کیا گیا تھا (یشوع ۱:۱۔۶)۔تاہم اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس زمانے تک مصر کے زوال کا عمل تیزی سے شروع ہو چکا تھا۔جبکہ فلسطین کا علاقہ تہذیب انسانی کا مرکز بن رہا تھا اور یہاں کی اقوام گردن تک شرک کی دلدل میں دھنسی ہوئی تھیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی شکل میں ایک خدا پرست قوم کو ان کے درمیان آباد کر دیا گیا۔ یہ وہی معاملہ تھا جو پہلے مصر میں کیا گیا تھا۔اس دوران میں ان کی رہنمائی کے لیے نبی ان میں آتے رہے اوران کے اجتماعی امور کی نگرانی قاضی کیا کرتے تھے،مگر صدیوں کے تعامل کے بعد ایک دفعہ پھر وہی کچھ ہونے لگا جو مصر میں ہوا تھا یعنی ایک طرف تو بنی اسرائیل میں شرک کے اثرات تیزی سے سرائیت کرنے لگے (قضاۃ ۲:۱۱۔۱۳) اور دوسری طرف بنی اسرائیل سیاسی طور پر مغلوب ہونے لگے۔ان کے اردگرد آباد مشرک اقوام نے متحد ہو کر ان پر حملے شروع کر دیے اور فلسطین کے بڑے حصے سے انھیں بے دخل کر دیا۔اس پر بنی اسرائیل میں جہاد کا داعیہ پیدا ہوا اور انھوں نے اس دور کے نبی حضرت سموئیل سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیا جائے تاکہ وہ بھی قومی حیثیت میں مشرکوں کا مقابلہ کر سکیں۔ان کی درخواست پر ان کے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔ان کی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور طالوت کی زیر قیادت انھوں نے مشرکوں کو شکست دے کر اپنا اقتدار قائم کر لیا (البقرہ ۲:۲۴۱۔۲۵۱)۔ یہیں سے بنی اسرائیل کی تاریخ کا سب سے روشن باب شروع ہوتا ہے جب طالوت کے بعد سیدنا داؤد اور پھر سیدنا سلیمان کے زمانے میں بنی اسرائیل کے اقتدار کا سکہ پورے مشرقِ وسطیٰ جو کہ اس دور کی تہذیب کا مرکز تھا پر چلنا شروع ہو گیا۔اس دور میں بنی اسرائیل کے اقتدار کا کیا عالم تھا اور کس طرح توحید کی بنیاد پر قائم اس معاشرے نے اردگرد کے مشرکوں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا،اس کا ایک نمونہ وہ واقعہ ہے جو ملکۂ سبا اور حضرت سلیمان کے حوالے سے سورۂ نمل (۲۷) آیات ۱۵۔۴۴ میں مذکور ہے۔ یہ زمانہ ۱۰۰۰ ق م کے لگ بھگ کا ہے۔

تاہم حضرت سلیمان کے بعد چند صدیوں کے اندر اندر بنی اسرائیل میں وہ تمام برائیاں پیدا ہو گئیں جن کے خلاف انھیں جنگ کرنا تھی۔آنجناب کی عظیم حکومت دو ریاستوں یہودیہ اور اسرائیل میں تقسیم ہو گئی۔اس دوران میں کثرت کے ساتھ نبیوں نے بنی اسرائیل کو ان کی غلط روی پر متنبہ کیا،مگر بے سود۔آخر کار خدائی عذاب کا کوڑا بنی اسرائیل پر برس پڑا۔ پہلے ریاست اسرائیل آشوریوں کے حملوں میں برباد ہو گئی۔۷۲۱ ق م میں اشوری حکمران سارگون نے اس کے دارالحکومت سامریہ کو فتح کر لیا۔دوسری طرف ۵۸۷ ق م میں یہودیہ کی ریاست کے تمام شہر بابل کے حکمران بخت نصر کے حملے میں برباد ہو گئے۔ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی اور ہیکل سلیمانی کو زمین بوس کر دیا گیا۔اور بخت نصر بنی اسرائیل کو غلام بنا کر بابل لے

گیا۔

یہ بنی اسرئیل کے فساد کے جواب میں خدا کی پہلی عظیم سزا تھی جس کا تذکرہ سورۂ بنی اسرائیل (۱۷) آیات ۴۔۸ میں کیا گیا ہے۔اس کے بعد خدا نے ان کے حال پر مہربانی کی۔ ایرانی حکمران سائرس نے انھیں بابل کی غلامی سے نجات دلائی اور واپس فلسطین آنے کی اجازت دی۔ ہیکل کی دوبارہ تعمیر ہوئی اور حضرت عزیر کی رہنمائی میں بنی اسرائیل کے دین کی ایک دفعہ پھر تجدید کی گئی۔ان کی تجدید کی مساعی اس قدر موثر تھی کہ اس واقعہ کے تین صدی بعد بھی جب یونانی حکمرانوں نے بنی اسرائیل پر شرک مسلط کرنا چاہا تو انھوں نے بھرپور مزاحمت کی اور آخر کار ان کو فلسطین سے باہر نکال دیا۔ انعام کے طور پر خدا نے ان کی سلطنت کو اتنا وسیع کر دیا کہ اس کا علاقہ حضرت سلیمان کے دورِ اقتدار سے بھی بڑھ گیا۔ تاہم ایک صدی کے اندر یہ اخلاقی روح فنا ہوتی چلی گئی۔ جس کے نتیجے میں خدا نے رومیوں کو ان پر مسلط کر دیا اور رومی فاتح پومپی نے ۶۳ ق م میں یروشلم پر قبضہ کر کے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا اور بالواسطہ رومی حکومت قائم کر دی۔ اس عرصہ میں بنی اسرائیل کا زوال اپنی انتہاؤں کو پہنچ رہا تھا جس کا اظہار اینٹی پاس نامی یہودی حکمران کے دربار میں ایک رقاصہ کی فرمایش پر سیدنا یحییٰ کے قتل سے ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بحیثیت امت آخری مہلت کے طور پر بنی اسرائیل میں حضرت عیسیٰ جیسے جلیل القدر رسول کو مبعوث فرمایا۔ انھوں نے آخری درجہ میں بنی اسرائیل کو تنبیہ کی، مگر حب دنیا اور ظاہر پرستی کے پھندوں میں گرفتار بنی اسرائیل نہ صرف یہ موقع گنوا بیٹھے، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے آپ کے قتل کی سازش کر ڈالی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آفتاب رسالت کو اٹھا لیا اور اس جرم عظیم کی پاداش میں بنی اسرائیل کو منصب امامت سے معزول کر کے ایک زبردست سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد یہودیوں نے رومیوں کے خلاف بغاوت کی جسے فرو کرنے کے لیے رومی حکمران ٹیٹس نے یروشلم پر حملہ کر کے پوری آبادی کو تہس نہس کر ڈالا۔ اور یہودیوں کو اس طرح فلسطین سے نکالا کہ وہ دو ہزار سال تک یہاں واپس نہ لوٹ سکے۔

بنی اسرائیل کی تقریباً ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کا یہ ایک انتہائی مختصر بیان ہے جو نہ صرف اس بات پر گواہ ہے کہ کس طرح وہ دنیا میں امامت کے منصب پر فائز رہے، بلکہ تاریخ کے اس آئینے میں یہ بات بھی صاف نظر آتی ہے کہ ان کے عروج و زوال کا تمام تر انحصار صرف اس بات پر تھا کہ وہ کس حد تک خدا کے ساتھ کیے گئے اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ڈاکٹر خورشید رضوی

”رجعت پسندی“

[گزشتہ دنوں حلقۂ ارباب ذوق، لاہور کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر خورشید رضوی نے انجام دیے۔ ان کا صدارتی خطبہ علم و ادب کا شاہ کار ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی روایات کی طرف مراجعت کا داعی بھی تھا۔ افادۂ عام کے لیے ہم اسے یہاں شائع کر رہے ہیں۔]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آج کی محفل میں زیر بحث لانے کے لیے میرے پاس کون سا ادبی مسئلہ ہے، یہ جاننے کے لیے جب میں اپنے گریباں میں غوطہ زن ہوا تو مجھے اپنے دل کی تہوں میں چھوٹے بڑے کئی مسائل لرزاں نظر آئے۔ جس مسئلے نے میری توجہ فوری طور پر اپنی جانب مبذول کرائی، اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس پر رجعت پسندی کا لیبل بڑی آسانی سے چسپاں کیا جا سکتا ہے۔ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش اگر رجعت پسندی ہے تو اس سے مفر نہیں کہ اچھے ادب کا نصف سے زائد حسن اسی آرزوے باز دید میں مضمر ہے۔ دوش کے آئینے میں فردا کو دیکھنا شیوۂ صاحب نظراں ہے۔ جدت پسندی اپنی جگہ برحق ہے کہ تازہ کاری کے بغیر شب و روز کا یہ تسلسل ایک بوجھل تکرار میں تبدیل ہو جاتا ہے اور تازہ ہوا کی طلب میں، ہر سچی روح، امروز و فردا کے اس میکانکی زنداں کو توڑ ڈالنا چاہتی ہے، بقول اقبال:

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانہ امروز وفردا ساختی

لیکن جہان نو کی تعمیر کے لیے جہان کہنہ کی راکھ بہر حال درکار ہوتی ہے، چنانچہ جدت پسند اقبال کو بھی یہ خواہش برابر رہتی ہے کہ:

گرد شے باید کہ گردوں از ضمیر روزگار
دوش من باز آرد اندر کسوت فردائے من

آج گیارہ مئی ہے، مجید امجد کی وفات کا دن، جس نے کہا تھا:

ہاں اسی گم سم اندھیرے میں ابھی
بیٹھ کر وہ راکھ چننی ہے ہمیں
راکھ ان دنیاؤں کی جو جل بجھیں
راکھ جس میں لاکھ خونیں شبنمیں
زیست کی پلکوں سے ٹپ ٹپ پھوٹتی
جانے کب سے جذب ہوتی آئی ہیں
کتنی روحیں ان زمانوں کا خمیر
اپنے اشکوں میں سموتی آئی ہیں

آج گزشتہ کی راکھ میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جس چنگاری کی تپش سے میری پوریں جل اٹھی ہیں، وہ ان زبانوں، روایتوں، تلمیحوں اور علامتوں کا افسوس ناک زوال ہے، جو ہمارے ادب کو ماضی سے مربوط رکھتے ہوئے اسے آیندہ کے سفر پر روانہ ہونے کا حوصلہ بخشتی تھیں۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ تازہ واردان بساط ادب، فارسی ادب کی روایت سے کٹ جانے کے نتیجے میں، اپنے عظیم ترین شعرا، غالب اور اقبال کے نصف سے زائد کلام سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔

عربی اور فارسی جو ہمارے کلاسیکی ورثے کے بنیادی سانچے مہیا کرتی ہیں کوئی مردہ زبانیں نہیں ہیں۔ عربی تمام مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونے کے علاوہ، آج سعودی عرب، یمن، خلیج کی امارت متحدہ، عمان، کویت، بحرین، قطر، عراق، شام، اردن، لبنان، مصر، سوڈان، لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش کی سرکاری اور بائیس کروڑ کے لگ بھگ انسانوں کی مادری زبان ہے۔

۱۹۷۴ء سے اسے اقوام متحدہ کی چھٹی رسمی زبان ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ فارسی اور اردو ادب پر قرآن وحدیث کے علاوہ عربی ادب کا جو اثر مرتب ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ فارسی کے حوالے سے سر دست ایک رومی کو ہی لے لیجیے۔ رومی آج کے امریکہ میں craze کے طور پر ابھرا ہے اور اس کے کلام کے انگریزی تراجم ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہے ہیں۔ انٹرنیٹ پر بعض 'websites' رومی کے لیے مخصوص ہیں۔ ''مثنوی مولوی معنوی'' کو ہمارے ہاں بھی ''ہست قرآں در زبان پہلوی'' کی حیثیت حاصل رہی اور اقبال نے رومی کو مرشد تسلیم کر کے اس کی ذات اور فن کی وہ جہتیں دریافت کیں جنھوں نے اسے جہد پیہم اور خود شناسی کی علامت بنا دیا۔

کلیلہ ودمنہ، الف لیلہ، گلستاں بوستاں، شاہنامہ فردوسی، دیوان حافظ اور رباعیات خیام جیسے ادب پاروں کو رفتہ وگزشتہ کے غلاف میں لپیٹ کر طاق نسیاں پر رکھ دینا ممکن نہیں۔ ان کی تابانی نے صرف مشرق ہی نہیں مغرب کو بھی ضیا بخشی ہے۔ بہت دور کی بات نہیں کہ ہمارے ہاں خانہ نشیں خواتین کو بھی گلستاں بوستاں سے واقفیت حاصل تھی اور آج صورت حال یہ ہے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کہ دانش وروں کی محفل میں بھی، عربی تو درکنار، فارسی شعر پڑھنا بھی سخت دشوار ہوتا جا رہا ہے۔

فارسی روایت سے مربوط ہوئے بغیر ہم مثال کے طور پر، اقبال کے ہاں فرمان خدا (فرشتوں سے) کا یہ شعر کیونکر سمجھ سکتے ہیں:

حق را بسجودے، صنماں رابطوافے
بہتر ہے چراغ حرم ودیر بجھا دو

اس شعر میں نہ صرف یہ کہ پہلا مصرع فارسی میں ہے، یہ ایک تلمیح کی حیثیت بھی رکھتا ہے جو غالب کے اس شعر سے مربوط ہے:

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند
حق را بسجودے ونبی رابدرودے

یعنی ہرگز ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو خدا کو ایک سجدے سے اور پیغمبر کو ایک درود سے فریب دینا چاہتے ہیں۔ اقبال کے ہاں بات چونکہ ''حرم ودیر'' کے حوالے سے ہو رہی ہے، اس لیے ''حق'' کے موازنے میں ''صنم'' درکار تھا، چنانچہ انھوں نے ''نبی رابدرودے'' کا ٹکڑا ''صنماں رابطوفے'' سے بدل دیا، لیکن ''حق رابسجودے'' کا ٹکڑا برابر غالب کے شعر کی تلمیح بنا رہا، جس سے ''فریبند'' جو اقبال کے ہاں محذوف ہے اور جس کے بغیر مصرع کا مفہوم مکمل نہیں ہوتا، از خود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یعنی حرم میں حق کو ایک سجدے سے اور دیر میں اصنام کو ایک طواف سے فریب دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اصلیت کہیں باقی نہیں رہی، لہٰذا بہتر ہے کہ حرم اور دیر، دونوں کا چراغ گل کر دیا جائے۔

اسی طرح نظم طلوع اسلام میں اقبال کا یہ شعر:

وہ چشم پاک بیں کیوں زینت برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مرد غازی کی جگر تابی

اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک، بطور پس منظر، عرفی کا یہ شعر ذہن میں نہ ہو:

بخوا ں آلودہ دست وتیغ غازی ماندہ بے تحسیں
تو اول زیب اسپ وزینت برگستوں بینی

یعنی مرد غازی کے خون آلودہ دست وتیغ کی کچھ داد نہ دی گئی۔ تو پہلے گھوڑے کی زیبایش اور برگستواں یعنی زرہ کی زینت کو دیکھنے میں لگا ہوا ہے۔ مراد یہ کہ چشم ظاہر بیں ظواہر میں الجھ کر اصل اہمیت کی چیز پر توجہ نہیں دیتی۔ اسی مضمون پر بنیاد اٹھاتے ہوئے اقبال نے یہ کہا کہ جو آنکھ ظاہر بیں نہیں، بلکہ پاک بیں ہے اور مرد غازی کی جگر تابی اسے نظر آ سکتی ہے، وہ بھلا زرہ کی زیب وزینت میں کیوں محو ہو؟

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اقبال ہی کی ایک اور دوبیتی اس موقع پر یاد آ رہی ہے:

صبنت الکاس عنا ام عمرو
وکان الکاس مجراھا الیمینا

اگر ایں است شرط دوستداری
بدیوار حرم زن جام و مینا

پہلا شعر عمرو بن کلثوم کا ہے اور جس نظم سے ماخوذ ہے، وہ سبع معلقات میں شامل ہے۔ یہ شعر معلقے کے حصۂ تشبیب کا شعر ہے۔ یہ حصہ تمہیدی عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ شاعر گریز کر کے اصل موضوع کی طرف آ تا ہے۔ ''امّ عمروٗ' محبوبہ کا نام ہے جو ساقی گری کر رہی ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اے ام عمرو تو نے جام کو ہماری طرف سے روک کر دوسروں کی طرف پھیر دیا، حالانکہ قاعدہ یہ ہے کہ جام کی گردش کا آغاز دائیں طرف سے ہوتا ہے۔ دائیں طرف ہم تھے اور بائیں طرف اغیار۔ مگر تو نے یہ کیا کیا کہ خلاف قاعدہ ان سے آغاز کیا۔ معلقہ عمرو بن کلثوم کا یہ شعر تشبیب کا اکہرا روایتی شعر ہے جس میں ایک سے زیادہ مفاہیم کی گنجایش نہیں، لیکن اقبال کے پہلو دار تخلیقی ذہن نے جب اسے چھوا تو تہ بہ تہ مفہوم پیدا کر کے نئی وسعتوں سے آشنا کر دیا اور وہ امکانات اس سے پیدا کر لیے جن کا اس شعر کے حوالے سے صدیوں میں کسی کو خیال نہ آیا ہوگا۔ اقبال کے ہاں ام عمرو کا علامتی خطاب محبوب حقیقی کی طرف منتقل ہو گیا ہے اور مفہوم وہی شکوے کا ہے کہ:

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

اقبال کے ہاں قرآن مجید کے اصحاب المیمنہ یا اصحاب الیمین (یعنی دائیں طرف والے) اور ''اصحاب المشئمہ'' یا ''اصحاب الشمال'' (یعنی بائیں طرف والے) کے مفہوم کی چھوٹ بھی اس قبل از اسلام کے شعر پر پڑ رہی ہے اور یہ غیر محسوس طور پر دور جدید کے 'Rightist' اور 'Leftist' کے تصور تک بھی پھیل گیا ہے۔ یوں ایک قدیم/ جدید تناظر میں اپنوں کو محروم رکھنے اور غیروں کو فیض یاب کرنے کا شکوہ کرتے ہوئے اقبال، دوسرے شعر میں اپنی مخصوص بے باکی کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اگر دوستداری کا یہی طریقہ ہے اور ساقی گری اسی انداز سے ہوتی ہے تو پھر جام و مینا کو دیوار حرم پر دے مار۔

خواتین وحضرات! یہ مسئلہ عربی و فارسی پس منظر تک ہی محدود نہیں، وہ ثقافتی حوالے جو خالصتاً اردو کے اپنے ہیں، ان سے ربط بھی اب ختم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آزاد نے آب حیات میں میر تقی میر کی ہجو میں بقاء اللہ خاں بقا کے چند اشعار نقل کیے ہیں جن میں سے ایک یوں ہے:

لے کے دیواں پکارتے پھریے
ہر گلی کوچہ کام شاعر کا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس شعر کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا جب تک یہ ثقافتی پس منظر معلوم نہ ہو کہ جس طرح پنجاب میں مختلف پیشوں کی مختلف ہانکیں ہوتی ہیں جن کے الفاظ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں دور سے آتی ہوئی ہانک کا آہنگ ہی بتاتا ہے کہ بڑھئی یا قلعی گر آیا ہے، اسی طرح یوپی میں بڑھئی کی ایک ہانک تھی ''کام بڑھئی کا''۔ اس میں لفظ ''کام'' بہت کھینچ کر اور ''بڑھئی'' کا تیزی سے ادا کیا جاتا تھا۔ اس ہانک کی لے بڑھئی کی آمد کا پتا دیتی تھی۔ بقا نے میر سے کہا ہے کہ تم کوئی شاعر تھوڑا ہی ہو، شاعری میں ٹھوکا پیٹی کرنے والے بڑھئی ہو، لہٰذا بڑھئی کے بقچے کی جگہ دیوان بغل میں مارو اور گلی گلی ہانک لگاؤ: ''کام شاعر کا''۔

پھر ہماری مشرقی شاعری کی روایت میں تلازمات و رعایات کا ایک انٹرلاک نظام ہوتا ہے۔ صدیوں کی ریاضت نے اس میں وہ Kaleidoscopic شان پیدا کر دی ہے کہ محض عکس در عکس کے بناؤ سے بے ترتیبی میں بھی ایک ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ اس نظام کے نقصانات بھی ہیں۔ اس نے شاعر کو تخلیقیت سے زیادہ تربیت پر مائل کر دیا نیز اس کے بل پر کم تر شاعری کی وضع ظاہری بھی معتبر نظر آنے لگتی ہے، یوں جیسے کوئی تہی مغز انسان، جبہ و دستار پہن کر بظاہر معقول دکھائی دینے لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس نظام نے تخلیقی شعرا کے کلام میں اعماق و جہات کا اضافہ بھی کیا۔ ان کے ہاں چونکہ تخلیقی زور بہت ہوتا ہے، اس لیے تلازمات سطح پر نظر نہیں آتے، بلکہ شعر کے اصل مضمون کے نفوذ کر جانے کے بعد رفتہ رفتہ یوں کھلتے ہیں جیسے بپھرے ہوئے سمندر کی موج کے آ کر چلے جانے کے بعد وہ گھونگے اور سیپیاں دکھائی دیتی ہیں جو وہ ساحل پر ڈال جاتی ہے۔ غالب نے اپنے فارسی دیوان کے دیباچے میں تعلیٰ کے کچھ شعر، تحدیث نعمت قرار دے کر درج کیے ہیں۔ ایک شعر دیکھیے:

میتواں پنجہ از نظامی برد
پارۂ جمع گر حواس کنم

مفہوم یہ ہے کہ اگر ذرا سی مہلت اپنے پراگندہ حواس کو مجتمع کرنے کی مل سکے تو میں نظامی سے پنجہ لڑا سکتا ہوں۔ یعنی کچھ ویسی ہی بات کہ:

ہم بھی تمھیں دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

غالب کے فارسی شعر کا اولین تاثر صرف مضمون شعر ہی کا تاثر ہے اور پہلی نظر میں تلازمات کا تانا بانا نظر نہیں آتا۔ لیکن مضمون کا کوندا جب لپک چکتا ہے تو پھر رفتہ رفتہ آنکھ، گویا، اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ تب نظر آتا ہے کہ ''پنجہ'' اور نظامی اور حواس میں ایک نظام رعایات پنہاں ہے۔ نظامی کا خمسہ مشہور ہے اور حواس خمسہ پانچوں حسوں کا مجموعی نام ہے جن کی پراگندگی کا شاعر کو شکوہ ہے اور لفظ پنجہ پانچ انگلیوں کا مجموعہ ہے جو خمسہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ اب تلازمات کا یہ تار و پود عیب نہیں، بہت بڑا ہنر ہے۔ یہ وہ جبہ و دستار نہیں جسے پہن کر ناکس کس نظر آنے لگتا ہے، بلکہ یہ عبا و قبا کی وہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

موزونیت ہے جو خوبی اندام پر راست آتی ہے اور کسی سرو قد کے قامت کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ ہم نے شاعری کا یہ جسم صدیوں کی ریاضت سے کمایا ہے۔ اس کی خاک کو رائیگاں نہ اڑا دینا چاہیے۔

خواتین وحضرات ! یہاں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میری یہ معروضات پس منظر کا فہم پیدا کرنے کے سلسلے میں ہیں، انھیں کورانہ تقلید کی دعوت تصور نہ کیا جائے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، روایت کے سانچے جب فرسودگی میں ڈھلنے لگتے ہیں تو تخلیق کی تازہ کاری انھیں توڑ ڈالنے کی ضرورت بھی محسوس کرتی ہے اور یقیناً اس کا حق بھی رکھتی ہے، لیکن اصولی طور پر، کسی بھی روایت کو توڑنے یا رد کرنے کے لیے اس کا علم اور اس پر قدرت رکھنا شرط ہے۔ چنانچہ خود روایت شکنی کے لیے روایت کو جاننا اور عملاً اس پر قادر ہونا ضروری ہے۔ اس علم اور اس قدرت کے بغیر روایت کے خلاف بغاوت کا نعرہ دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کا ایک بہانہ ہوتا ہے اور عربی مقولے 'الناس اعداء ما جھلوا' کا مصداق۔ یعنی لوگ جس چیز سے ناواقف ہوتے ہیں، اس کے دشمن ہوتے ہیں۔

اسی طرح یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ روایت سے وابستگی ہرگز جدت کے دروازے بند کر دینے کے مترادف نہیں۔ مغرب سے حذر کی ضرورت نہیں، لیکن مشرق سے بے زاری کا بھی کوئی جواز نہیں۔ دریا میں دیس دیس کی ندیاں آ کر ملتی رہیں اور دریا کا رنگ بدلتا رہے تو اس سے اس کے روپ میں اضافہ ہوتا ہے، مگر دریا کو بہنا اپنی ہی مٹی پر چاہیے۔ ہر قوم کا ایک عقبی دیار ہوتا ہے اور اس کی فضا میں اس قوم کا ادب یوں سانس لیتا ہے جیسے مچھلی، پانی کے وجود کا احساس کیے بغیر، پانی میں زندہ رہتی ہے۔

Keats کی نظم Ode To a Nightingale سے حظ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں Lethe اور Dryad اور Hippocrene اور Bacchus اور Ruth —— ان سب کے ساتھ وابستہ تصورات ومفاہیم سے آشنائی ہو۔ اسی طرح ہمارے داستانی ورثے کی علامات عمر عیار اور اس کی زنبیل، لقا اور اس کی داڑھی، سندباد اور اس کے سفر، رستم اور ہفت خواں، کوہ کن اور بے ستوں اور جوئے شیر اور پیرزن —— الغرض وہ پوری فضا جو عربی اور فارسی ادب کے دریچوں سے ہمارے ادب پر وارد ہوتی ہے، یہی وہ پانی ہے جس میں ہمارا ادب مچھلی کی طرح سانس لیتا ہے۔ اجنبی دھاروں سے اس پانی کی رنگت کو اور رنگین کرنا بجا، مگر اس پانی سے نکل جانا ماہی بے آب ہو جانے کے مترادف ہوگا۔

ہمیں اس بات کا جلد از جلد احساس کرنا چاہیے کہ مشرقی روایت کے سوتے اگر اسی طرح گرد وغبار سے اٹتے رہے تو ہمارا اصل سرچشمہ اندھا ہو جائے گا۔ ہمیں مغربی دریچے بند کیے بغیر مشرق کی طرف کے پرانے جھروکے بھی پھر سے کھولنے چاہییں، اس سے پہلے کہ وہ لاتعلقی کے زنگ سے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں۔ ہمیں اس جانب سے آنے والی ہوا کی ضرورت ہے اور دھوپ تو آتی ہی ادھر سے ہے۔

—— جاوید

O

رہتی ہے اگر گردشِ دوراں کوئی دن اور — دیکھیں گے یہی آدم و یزداں کوئی دن اور

شاید اِسی فرمان پہ قائم ہے جہاں اب — رہنے دو اِسے دست و گریباں کوئی دن اور

تہذیب کی یلغار میں ہے یہ بھی غنیمت — ناچار ہی رہ جائیں مسلماں کوئی دن اور

تیرہ ہیں مہ و مہر تو ہم اپنے لہو سے — کر دیتے ہیں یہ بزم چراغاں کوئی دن اور

بڑھتا ہی رہا درد ستم گر کی دوا سے — کیا خوب تقاضا ہے کہ درماں کوئی دن اور

ہوتی ہے اگر گرمیِ محفل کی تمنا — کر لیتے ہیں تنہائی کو مہماں کوئی دن اور

اس دور میں سرمایۂ اربابِ نظر بھی

اب ہوگا فراہی کا دبستاں، کوئی دن اور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org